یں اوران کا رُخ روہیلکھنڈ کی طرف تھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ان کے پیچھے
دستہ روانہ کر دیا جائے !"

الدولہ نے جواب دیا: " نہیں اب روہیلکھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی
ت نہیں ہو سکتے۔ جنگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ میں صرف
سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ اگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً
لیتا۔ اب اس کا راستہ روکنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں !"

سترھواں باب

ایک شام معظم علی اور اس کے ساتھی گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ اکبر خاں کے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی ایک ٹیلے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ معظم علی نے ٹیلے پر پہنچ کر اپنے سامنے اچانک وحشت ناک منظر دیکھا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ شام کے دھندلکے میں اکبر خاں کا گاؤں آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ نظر آتا تھا۔ ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اکبر خاں کی بستی سے آگے افق پر دو اور بستیوں میں آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحہ کے اندر اندر وحشت، بربریت اور مظلومیت کے کئی منظر معظم علی کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھی انتہائی پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اکبر خاں کا گاؤں ہے۔ اب وہاں شاید دشمن کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں !"

معظم علی کے ایک ساتھی نجف خاں نے کہا۔ "آپ کم از کم ایک آدمی کو ضرور ساتھ لے جائیے"

[illegible]

نجف خاں کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

معظم علی نے کہا: "اب گھوڑوں کو آگے لے جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں ٹھہرو اور میرا انتظار کرو۔ اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آیا تو میں بندوق چلا کر تمھیں خبردار کر دوں گا۔ پھر اگر میں صبح تک نہ پہنچوں تو تم باقی ساتھیوں کو لے کر واپس روانہ ہو جانا۔ میرا خیال ہے کہ بستی سے باہر اودھ یا انگریزی فوج کا کوئی دستہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ اکبر خاں کے گھر میں آگ لگی ہو اور علاقے کے لوگ دیوانوں کی طرح اس طرف نہ بھاگ رہے ہوں۔"

معظم علی نے اپنا گھوڑا نجف خاں کے سپرد کیا اور بھاگتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے گاؤں کی دوسری طرف آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گاؤں کے درمیانی حصے میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ آگ کا سارا زور اکبر خاں کی حویلی میں ہے۔ گاؤں سے باہر چند مقامات پر گندم کے کھلیان جل رہے تھے اور بعض کھیتوں میں پکی ہوئی گندم ابھی تک کھڑی تھی۔ معظم علی روشنی سے بچنے کے لیے گندم کے کھیتوں میں جھک جھک کر چلتا ہوا گاؤں کی دوسری طرف بڑھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک وسیع میدان میں فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ گاؤں سے آگ کی روشنی دور دور پہنچ رہی تھی۔ پڑاؤ کے درمیان چند خیمے نصب تھے اور پیچھے ایک ٹیلے کے نشیب میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ فوج کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ کچھ سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں زمین پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور باقی گاؤں کی طرف جمع ہو کر آگ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ اودھ کی فوج تھی۔

معظم علی گندم کے ایک کھیت میں رینگتا ہوا آگے بڑھا اور سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب جا پہنچا۔ اودھ کے سپاہیوں کے درمیان چند انگریز کھڑے تھے اور ان کے چہرے آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ معظم علی ان کی باتیں سننے کے لیے قریب جانا چاہتا تھا لیکن گندم کے کھیت سے آگے کوئی چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ سپاہیوں کے گروہ کے پاس معظم علی

کو دو توپیں دکھائی دیں۔

پہرے داروں کی ایک ٹولی گشت لگاتی ہوئی کھیت کے قریب سے گزری اور معظم علی کھیت کے کنارے سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا۔ ایک سپاہی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا: "اب اس علاقے کے لوگ خواب میں بھی کسی انگریز پر گولی نہیں چلائیں گے۔"

دوسرے نے کہا: "تم انھیں نہیں جانتے۔ یہ لوگ مرتے دم تک اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتے۔ تم نے ان کے سردار کو نہیں دیکھا؟ وہ رسیوں میں جکڑا ہوا بھی انگریز افسر کو گالیاں دے رہا تھا۔"

تیسرے نے کہا: "وہ تو نواب اودھ کو بھی گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے خاندان کے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ حملے سے پہلے یہاں سے نکل گئے تھے۔ ورنہ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچتا۔"

چوتھے نے کہا: "لیکن مجھے اب بھی یقین ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں پر گولی چلائی تھی وہ صبح تک اپنے سردار کی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے۔"

"لیکن اگر انھوں نے اپنے آپ کو پیش نہ کیا تو؟"

"تو کل اسے پھانسی دے دی جائے گی اور پھر اس قوم کی ہر بستی کا یہی حال ہوگا۔"

"لیکن یہ ظلم ہے!"

"ظلم کیا ہے یہ لوگ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہیں۔"

پہرے دار دور چلے گئے اور معظم علی اسی طرح رینگتا ہوا واپس لوٹا اور تھوڑی دیر بعد وہ کھیت سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔

○

معظم علی نے پگ ڈنڈی پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا لیکن نجف خاں اسے کہیں نظر نہ آیا۔ "نجف خاں! نجف خاں!!" اس نے دبی زبان سے آوازیں دیں اور پھر کسی طرف سے

جواب نہ پاکر اس نے سوچا شاید میں تاریکی میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آگیا ہوں۔ وہ پریشانی، اضطراب اور تذبذب کی حالت میں پگ ڈنڈی پر کھڑا تھا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ "اپنے ہتھیار پھینک دو تم ہماری بندوقوں کی زد میں ہو!"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر تم انگریز یا اودھ کی فوج کے سپاہی نہیں ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔"

"تم اپنے ہتھیار پھینک دو ہم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔"

معظم علی نے اپنی بندوق پھینک کر دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اکبر خاں کے ساتھی ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

پانچ آدمی بندوقیں سیدھی کیے کھیت کی مینڈ کی آڑ سے نمودار ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر معظم علی کو گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کی بندوق اٹھالی۔

معظم علی نے کہا۔ "میں اکبر خاں کا دوست ہوں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا ساتھی کہاں ہے؟"

ایک آدمی نے کہا۔ "اکبر خاں کے دوست اس طرح مسلح ہو کر رات کو اس علاقے میں نہیں آتے۔ تمھارا ساتھی اگر یہیں تھا تو وہ ہماری قید میں ہے اور اگر جنگل کے قریب ٹیلے پر بھی تم ہی اپنے چار اور ساتھیوں کو چھوڑ آئے تھے تو وہ بھی ہماری قید میں ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میرا نام معظم علی ہے اور اگر تم میں سے کوئی شخص اکبر کے گاؤں کا ہے تو میں اس پر یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ میں اکبر خاں کا دوست ہوں۔"

"ہم روہیلکھنڈ کے لوگوں کے سوا کسی کو اکبر خاں کا دوست نہیں سمجھتے۔ تم ہمارے ساتھ چلو!"

"میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے اکبر خاں کے خاندان کے لوگوں کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت اس کی والدہ، بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

ایک آدمی نے بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اکبر خاں کی والدہ اور اس کے خاندان کے کئی افراد کی لاشیں اس مکان کے اندر جل رہی ہیں لیکن تم نے اکبر خاں کے متعلق کیوں نہیں پوچھا؟"

"اکبر خاں کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت دشمن کی قید میں ہے۔ خدا کے لیے آپ اس کی بیوی اور بچوں کے متعلق بتائیے؟"

"اس کی بیوی اور بچے سلامت ہیں لیکن تمھارا ساتھی یہ کہتا تھا کہ تم لوگ لکھنؤ کے راستے میسور سے آرہے ہو، پھر تمھیں اکبر خاں کے متعلق یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ قید میں ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں ابھی دشمن کی فوج کا پڑاؤ دیکھ کر آرہا ہوں لیکن میں تمھاری تسلی نہیں کر سکتا۔ خدا کے لیے مجھے فوراً اکبر خاں کی بیوی کے پاس لے چلو وہ مجھے جانتی ہے۔"

"چلو!"

کھیتوں سے آگے قریباً دو میل گھنے جنگل میں چلنے کے بعد یہ لوگ ایک جگہ رکے جنگل کے پہریداروں میں سے کسی نے درختوں کی اوٹ سے آواز دی۔ "کون ہے؟"

معظم علی کے ایک ساتھی نے جواب دیا۔ "میں نعمت خاں ہوں، ہم نے چند قیدی بھیجے تھے وہ پہنچ گئے ہیں؟"

پہریدار نے جواب دیا۔ "وہ پہنچ گئے ہیں لیکن آپ سے بڑی غلطی ہوئی وہ قیدی نہیں ہیں، ان کا ایک ساتھی پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"وہ ہمارے ساتھ ہے۔"

"اسے آگے لے چلو!"

تاریک اور گھنے جنگل میں تھوڑی دور اور چلنے کے بعد معظم علی کو ایک جگہ روشنی دکھائی دی۔ ایک آدمی مشعل بلند کیے گھنے درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور معظم علی کے قریب پہنچ کر بولا۔ "آپ معظم علی ہیں؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"معاف کیجیے ہمارے آدمیوں سے بڑی بھول ہوئی۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ کے ساتھیوں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اکبر خاں کی بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

قریب سے آہوں، سسکیوں اور چیخوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "بھائی جان! میں یہاں ہوں۔"

اور ایک ثانیہ بعد بلقیس تاریکی سے نکل کر معظم علی کے سامنے کھڑی تھی۔ معظم علی نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا: "بلقیس اب باتوں کا وقت نہیں۔ بھائیو! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس جنگل میں کتنے آدمی ہیں جو ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟"

ایک آدمی نے جواب دیا: "اس جنگل میں آس پاس کی تمام آبادی جمع ہو چکی ہے لیکن جو لڑنے والے تھے، ان میں سے کچھ تو میراں پور کٹرہ کی جنگ میں کام آ چکے ہیں اور کچھ ہمارے گاؤں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ صبح تک انگریز اور اودھ کے سپاہی ہمیں بھی اس جنگل میں گھیر گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر تین چار سو آدمی اس وقت اپنی جانوں پر کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں تو ایسی صبح کبھی نہیں آئے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ دشمن کے پڑاؤ میں چار پانچ سو آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔"

ایک آدمی آگے بڑھ کر بے اختیار معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے کہا: "ان

شکست خوردہ آدمیوں کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ قدرت نے ہماری مدد کے لیے آپ کو بھیج دیا ہے۔ یہاں کم از کم دو سو آدمی ایسے ہیں جو پانی پت کی جنگ میں آپ کے ساتھ تھے۔ اگر آپ ہماری رہنمائی کریں تو ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اکبر خاں کو دشمن کی قید میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔"

معظم علی نے کہا۔ "تم فوراً تمام آدمیوں کو جمع کرو۔ ہم آدھی رات کے وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

چند منٹ کے اندر اندر جنگل کے طول و عرض میں پانی پت کے آزمودہ کار سپاہی کی آمد کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور بوڑھے جوان اور نوعمر لڑکے معظم علی کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان میں بعض وہ بھی تھے۔ جو تیرہ سال قبل پانی پت کے میدان میں معظم علی کے دوش بدوش دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ معظم علی انھیں ضروری ہدایات دینے کے بعد ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے روہیلکھنڈ کی جنگ اور بستی پر حملے کی تفصیلات سن رہا تھا۔

اکبر خاں کے گاؤں کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ اودھ اور انگریزوں کی افواج نے مختلف مقامات سے روہیلکھنڈ میں داخل ہو کر میراں پور کٹرہ کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اکبر خاں اپنے علاقے کے ایک ہزار جوانوں کو لے کر حافظ رحمت خاں کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی روانگی کے دو دن بعد اودھ سے کمک کے چند دستے اس علاقے میں داخل ہوئے ہمارے پاس بستیوں کی حفاظت کے لیے زیادہ آدمی نہ تھے۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر دشمن ہماری بستیوں میں داخل نہ ہو تو ہم کوئی مزاحمت نہ کریں لیکن اودھ کی فوج اس علاقے کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے ارادے سے ہمارے گاؤں میں داخل ہو گئی۔ ان کے ساتھ پانچ انگریز افسر تھے۔ گاؤں کے لوگ سراسیمہ ہو کر سردار اکبر خاں کی حویلی میں جمع ہو گئے۔ اودھ کے کمانڈر نے ہم سے مطالبہ کیا کہ اگر گاؤں کے لوگ اپنا اسلحہ ہمارے

حوالے کر دیں اور ہمیں سردار کے مکان کی تلاشی لینے دیں تو ان پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ دشمن کو یقین تھا کہ ہم اس کی دھمکی سے مرعوب ہو جائیں گے لیکن ہم نے یہ جواب دیا کہ اکبر خاں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تمھیں ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ ایک انگریز نے شیخی میں آکر حویلی کے دروازے پر ہوائی فائر کر دیا۔ اس کے جواب میں ہم نے گولیاں چلائیں اور پلک جھپکنے کی دیر میں دس پندرہ آدمی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں دو انگریز تھے۔ ایک انگریز نے زخمی ہو کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اودھ کے سپاہیوں کے لیے یہ صورتِ حالات غیر متوقع تھی اور وہ بھاگ نکلے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد تھی لیکن ہم نے تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پھر ہمیں میراں پور کٹرہ کے میدان میں اپنی شکست اور حافظ رحمت خاں کی شہادت کی اطلاع ملی۔ ہمارے علاقے کے چار سو نوجوان شہید ہوئے اور باقی اکبر خاں کے ساتھ واپس آ گئے۔

تین دن بعد ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اودھ کی فوج کے کچھ دستے چند انگریز سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں کا رخ کر رہے ہیں۔ سردار نے راتوں رات گاؤں کی عورتوں اور بچوں کو جنگل کی طرف بھیج دیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ اس فوج کی رہنمائی وہی انگریز افسر کر رہا ہے جو یہاں سے زخمی ہو کر بھاگا تھا۔ اس نے سردار اکبر خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم انگریز افسروں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو تو بہتر ورنہ تمھارے مکان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔

لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے تین بار حویلی پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار انھیں ہماری گولیوں کی بارش میں پیچھا ہٹنا پڑا۔

اگلے دن ان کی دو توپیں پہنچ گئیں اور انھوں نے گاؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ تیسرے پہر تک گاؤں ملبے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ اکبر خاں کے تین چچازاد اور دو ماموں زاد بھائی مارے جا چکے تھے۔ ان کی والدہ جو خاندان کی دوسری عورتوں کے ساتھ جانے کی بجائے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے پر مصر تھیں، زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ اکبر خاں کی حویلی کے محافظوں کو باہر سے دشمن محاصرے میں لیے ہوئے تھا اور حویلی کے اندر وہ بڑی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ چند گھوڑے حویلی کے اندر بندھے ہوئے تھے لیکن سردار کے ساتھیوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اس نے ہم میں سے بہترین نیزہ بازوں کو گھوڑوں پر سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد حویلی کا دروازہ کھولا گیا اور سردار نے سواروں کے ساتھ نکل کر گاؤں کے جنوب کی طرف دشمن کی صفوں پر حملہ کر دیا۔ اس کے پیچھے باقی آدمی بھی نکل آئے۔ دشمن کی گولیوں سے چار سوار شہید ہو گئے۔ اکبر خاں کے گھوڑے کو گولی لگی اور وہ گر پڑا۔ میرے ساتھ پندرہ آدمیوں نے مڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اکبر خاں کو اس حال میں چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہ کیا اور اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ دشمن نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ باقی آدمیوں میں سے چند زخمی اور شہید ہو گئے اور باقی لڑتے بھڑتے نکل گئے۔ اکبر خاں کو تھوڑی دیر بعد ہوش آ گیا اور انگریز افسر نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنے قبیلے کے تمام آدمیوں کو یہاں جمع کر کے ہماری وفاداری کا یقین دلاؤ اور ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دو جنھوں نے دو انگریز افسروں کو ہلاک کر دیا تھا تو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔ ورنہ کل تمھیں پھانسی دے دی جائے گی۔ اکبر خاں نے جواب دیا۔ ”تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن ذلیل نہیں بنا سکتے۔“ میں نے انگریز افسر سے کہا ”اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں کل تک اس علاقے کے تمام چیدہ چیدہ آدمیوں کو یہاں حاضر کرنے کا ذمہ لیتا ہوں اور میں اس بات کا ذمہ بھی لیتا ہوں کہ انگریز افسروں کے قاتلوں کو آپ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔“ انھوں نے مجھے رہا کرتے وقت یہ دھمکی دی کہ اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو اکبر خاں کے ساتھ تمھارے باقی ساتھیوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اکبر خاں نے مجھے غداری اور بزدلی کے طعنے دیئے۔ کاش میں اس کے کان میں اتنا کہہ سکتا کہ میں یہ سب کچھ تمھارے لیے کر رہا ہوں۔

آپ کی آمد سے پہلے میں رات کے وقت دشمن کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرچکا تھا اور کوئی تین سو آدمی میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ بھی ہوگئے تھے لیکن ہمیں اپنی کامیابی بے حد مخدوش نظر آتی تھی۔ اب مجھے یقین ہے کہ قدرت نے آپ کو بلا وجہ نہیں بھیجا ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے جب میں نے ان سے درخواست کی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر کہاں جائیں لیکن اب ان کی عورتیں اور بچے بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

ایک کمسن بچے نے معظم علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا"

معظم علی نے اسے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا تمھارا نام کیا ہے؟"

"شہباز"۔ اس نے جواب دیا۔

پیچھے سے بلقیس کی آواز آئی "شہباز یہ تمھارے چچا جان ہیں"۔

* * *

اودھ کے سپاہی اور ان کے انگریز ساتھی رات کے دو بجے پہریداروں کی چیخ و پکار بندوقوں کی آوازیں اور حملہ آوروں کے نعرے سن کر بیدار ہوئے۔ آن کی آن میں پڑاؤ کے اندر افراتفری پھیل گئی۔ حملہ آور تین اطراف سے پڑاؤ میں داخل ہو کر قتل عام شروع کرچکے تھے۔ تاریکی میں اودھ کے سپاہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ روہیلکھنڈ کی ساری آبادی ان کے پڑاؤ پر حملہ کرچکی ہے۔ افسروں میں سے کوئی صفیں درست کرنے اور کوئی اپنے سپاہیوں کو بھاگنے کا حکم دے رہا تھا۔ سراسیمگی کی حالت میں اودھ کے کئی سپاہی اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ انھیں جنوب مشرق کے سوا ہر سمت حملہ آوروں کا سیلاب نظر آرہا تھا۔ بیشتر سپاہی اس طرف بھاگ نکلے۔

تھوڑی دیر میں جنوب مشرق کی طرف ایک عام پسپائی شروع ہوچکی تھی لیکن کوئی دو فرلانگ دور، بھاگنے والوں کو کھیتوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ

وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً دو سو آدمیوں نے جو تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے، کھیت سے نکل کر ان پر ہلہ بول دیا۔ بعض سپاہیوں نے عقب کے ٹیلے کی طرف سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور ٹیلے کے نشیب پر بھی قابض ہوچکے تھے۔

اکبر خاں اور اس کے ساتھی قید کی حالت میں پڑاؤ کے درمیان انگریز سپاہیوں کے خیموں سے کچھ دور پڑے ہوئے تھے اور اودھ کے جو سپاہی ان کی حفاظت پر متعین تھے انتہائی اضطراب کی حالت میں ان سے پوچھ رہے تھے "یہ کون ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں — یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد تمھیں یہ معلوم نہیں رہے گا کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے"

اودھ کی فوج کا ایک افسر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پہریداروں سے پوچھا "قیدی کہاں ہیں؟"

"قیدی یہیں ہیں" ایک پہریدار نے جواب دیا "ان کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟"

افسر جواب دینے کی بجائے آگے بڑھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "سردار اکبر خاں! اس حملے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے سالار اور انگریز افسروں نے تمھیں فوراً قتل کر دینے کا فیصلہ کیا ہے"

اکبر خاں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھے قتل کر کے تم اپنی جانیں نہیں بچا سکتے۔"

"لیکن اگر تم یہ قتل عام بند کرانے کا وعدہ کرو تو میں تمھیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں"

اکبر خاں نے جواب دیا "میں تمھارے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کرسکتا"

افسر نے جلدی سے اپنا خنجر نکال کر اکبر خاں کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹتے ہوئے

کہا۔ "مجھے ایک بہادر دشمن سے کوئی وعدہ لینے کی ضرورت نہیں۔" پھر اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ "ان سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ جلدی کرو!"

سپاہیوں نے قیدیوں کی رسیاں کاٹنی شروع کر دیں۔

اکبر خاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے ہتھیار ہمارے حوالہ کر دو اور اسی جگہ بیٹھے رہو۔"

نوجوان افسر نے کہا۔ "اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ اودھ کے سپاہیوں کو امان دیں گے تو ہم اپنے ہتھیار آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں لڑائی ختم ہونے سے پہلے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔"

افسر نے اپنی تلوار نکال کر اکبر خاں کو پیش کر دی اور باقی پہریداروں نے بھی اپنے اپنے ہتھیار قیدیوں کے سامنے پھینک دیئے۔

قیدی ابھی تلواریں اور بندوقیں اٹھا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

"قیدی کہاں ہیں؟"

"قیدی یہاں ہیں۔" اکبر خاں نے جواب دیا۔

نوجوان افسر نے دبی زبان میں کہا۔ "یہ ہمارے کماندار ہیں۔"

کماندار پانچ اور سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ "اکبر خاں کے سوا باقی تمام قیدیوں کو رہا کر دو اور ان سے کہو کہ اگر دس منٹ کے اندر اندر انھوں نے حملہ آوروں کو واپس جانے پر آمادہ نہ کیا تو اکبر خاں کی گردن مار دی جائے گی۔"

اکبر خاں نے اچانک بڑھ کر حملہ کیا اور کماندار ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ کماندار کے ساتھیوں نے ابھی اپنی بدحواسی پر قابو نہیں پایا تھا کہ اکبر خاں نے دوسرے وار میں ایک اور آدمی کو مار گرایا۔ باقی قیدی دوسرے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور آن کی آن میں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس عرصہ میں پڑاؤ پر حملہ آوروں کا گھیرا بہت تنگ

ہو چکا تھا۔ تاہم وہ تاریکی میں غیر ضروری نقصان سے بچنے کے لیے دشمن کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کی بجائے اکاّ دکاّ حملوں پر اکتفا کر رہے تھے۔ حملہ آوروں کی ایک ٹولی ایک شدید حملے کے بعد انگریزوں کے خیموں کے قریب پہنچ چکی تھی۔

اکبر خاں اس افسر کی طرف متوجہ ہوا جس نے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے کہا۔ "اب تم ہمارے ساتھی ہو۔ میں ایک افسر کو اس کے اپنے سپاہیوں کے خلاف لڑنے کے لیے نہیں کہوں گا لیکن تم انھیں ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دے کر بہت سے آدمیوں کی جانیں بچا سکتے ہو۔"

افسر بھاگ کر آگے بڑھا اور چاروں طرف سے سمٹتی ہوئی فوج کے درمیان کھڑا ہو کر بلند آواز میں چلاّنے لگا۔ "کماندار مارا گیا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہتھیار ڈال دو!"

تھوڑی دیر میں اودھ کے سپاہی اس کا یہ پیغام ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پہنچا چکے تھے۔ انگریز سپاہیوں کے خیموں کے آس پاس ابھی تک شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس طرف بڑھا اور اس نے پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ چند آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ اپنا راستہ صاف کرتا ہوا حملہ آوروں سے جا ملا اور بلند آواز میں چلاّیا۔

"میں اکبر خاں ہوں!"

اکبر خاں کے ایک رشتہ دار نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اکبر خاں تم کہاں تھے؟ ہم تمھیں سارے پڑاؤ میں تلاش کر چکے ہیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "تمھارے کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس حملے کی رہنمائی کون کر رہا ہے؟"

کوئی تاریکی میں آگے بڑھا اور اکبر خاں سے لپٹ کر بولا۔ "بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

اکبر خاں نے کہا۔ "اگر آپ معظم علی ہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کی بھیانک رات میں ایک اور عجیب سپنا دیکھ رہا ہوں"۔

لڑائی قریباً ختم ہو چکی تھی اور لبقیۃ السیف سپاہی جگہ جگہ ہتھیار پھینک کر امان طلب کر رہے تھے۔ معظم علی نے تمام قیدیوں کو ایک جگہ جمع کرنے اور مشعلیں جلانے کا حکم دیا۔ حملہ آوروں کے بیس آدمی زخمی اور سات ہلاک ہوئے تھے اس کے مقابلے میں اودھ کی فوج کے اسی آدمی ہلاک اور کوئی ڈیڑھ سو زخمی ہو چکے تھے۔ اودھ کی یہ فوج پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ہلاک ہونے والوں کے علاوہ ان تیس چالیس آدمیوں کے سوا جو تاریکی میں موقع پا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ باقی سب حملہ آوروں کی قید میں تھے ہلاک ہونے والوں میں پانچ انگریز بھی تھے اور باقی دس انگریز جن میں وہ لیفٹیننٹ بھی تھا جو اپنے دو ساتھیوں کی موت پر اس گاؤں کو سزا دینے کی نیت سے آیا تھا، قید ہو چکے تھے۔

معظم علی نے اکبر خاں سے کہا۔ "یہاں میرے حصے کا کام ختم ہو چکا ہے موجودہ حالات میں تمھارے قبیلے کے لوگ یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہمیں بہت جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ ان قیدیوں کے متعلق فیصلہ کرنا اب تمھارا یا تمھارے قبیلے کے لوگوں کا کام ہے۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "اودھ کے سپاہیوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ انگریز میرے حوالے کر دیے جائیں"۔

"تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا اور آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ ان کے متعلق کوئی سفارش نہ کریں"۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر میں انھیں جنگی قیدی سمجھتا تو یقیناً ان کے ساتھ اسی

سلوک کا مطالبہ کرتا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن میں ان بھیڑیوں کو انسان سمجھنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تمھیں ان پر مکمل اختیار ہے"۔

اکبر خاں کے حکم سے اس کے آدمیوں نے لیفٹیننٹ اور اس کے ساتھ دوسرے انگریزوں کو پکڑ کر باقی قیدیوں سے الگ کر لیا۔ پھر چند آدمیوں نے خیموں کے رسے کاٹ کر ان کی گردنوں میں ڈال دیئے۔ اکبر خاں کے ساتھ چند آدمی انگریزوں کو گھیرے میں لے کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

انگریز لیفٹیننٹ چلّایا۔ "ہماری فوج جلد یہاں آئے گی اور اگر تم نے ہمارے ساتھ زیادتی کی تو وہ تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

ایک نوجوان نے بڑھ کر اپنی تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی اور وہ خاموش ہو گیا۔

اکبر خاں نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تمھاری فوج ضرور آئے گی لیکن وہ صرف ہماری بے بسی کا تماشا ہی نہیں دیکھے گی"۔

دوسرا انگریز بولا۔ "سردار صاحب! اگر آپ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ انگریز اس علاقے پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے"۔

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں تم لوگوں کے وعدوں کی حقیقت سے واقف ہوں"۔

لیفٹیننٹ نے چند قدم اور چلنے کے بعد کہا۔ "آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں حیران ہوں کہ تم اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہو"۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد اکبر خاں کے مکان کے سامنے آم کے ایک درخت کی مضبوط شاخوں کے ساتھ دس آدمیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں اور وہ دروازے کے سامنے کھڑا اس آگ کے انگاروں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی زندگی کی بیشتر راحتوں اور مسرتوں

کو بھسم کر چکے تھے۔

ایک طرف سے حویلی کی دیوار توپوں کی گولہ باری کے باعث ٹوٹی ہوئی تھی۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی اس کی طرف سے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں جگہ جگہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اکبر خاں کے ساتھی لاشیں اٹھا کر باہر نکل آئے اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اس کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ملبے کے ڈھیر سے اب تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کمرے میں اس کی ماں کی لاش دفن تھی۔

"اکبر خاں! اکبر خاں!" اس کے کسی ساتھی نے آواز دی اور وہ حویلی سے باہر نکل آیا۔

جب صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے تو روہیلے پڑاؤ میں اپنے ساتھیوں کی لاشیں دفن کرنے میں مصروف تھے۔ اودھ کی فوج کا نوجوان افسر جس نے رات اکبر خاں کو قید سے آزاد کیا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر بولا: "آپ نے ہمارے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں یہ اس لیے نہیں پوچھتا کہ مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ میں اس دن مر چکا تھا جب میراں پور کٹرہ کے میدان میں میری تلوار ایک بے گناہ مسلمان کے خون میں آلودہ ہوئی تھی۔ ضمیر کی موت کے بعد جسم کی موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی لیکن ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جنھیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس ملک کے مسلمانوں کے لیے روہیلکھنڈ کے حریت پسندوں کی تباہی کیا نتائج پیدا کرے گی۔ یہ لوگ جنگ میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ اودھ میں پیدا ہوئے تھے اور اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ اگر یہ روہیلکھنڈ میں پیدا ہوئے ہوتے تو یہ حافظ رحمت خاں کی طرف سے لڑتے۔ میں نیکی بدی کا شعور رکھتا تھا لیکن میرا ضمیر شاید اس لیے مر چکا ہے کہ میں ایک بے ضمیر حکمران کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر چکا ہوں۔ تاہم میری سزا ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہونی چاہیئے۔"

اکبر خاں نے معظم علی کی طرف دیکھا اور معظم علی نے نوجوان کی طرف چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میرا نام عبداللہ ہے۔"

معظم علی نے کہا: "پانی پت کی جنگ میں اودھ کی فوج کا ایک سالار ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی شکل بالکل تم جیسی تھی۔ شاید اس کا نام محمد عمر تھا۔ جب ہم دشمن کا تعاقب کر رہے تھے تو وہ ہمارے ساتھ تھا اور اس نے بڑی بہادری سے جان دی تھی۔"

عبداللہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "وہ میرا باپ تھا۔"

اکبر خاں نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے مجھے اپنی فوج کے کمانڈر کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔"

معظم علی نے کہا۔ "عبداللہ! اگر تم محمد عمر کے بیٹے ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم دو دن ان سپاہیوں کو اسی علاقے میں ٹھہرانے کی کوشش کرو۔ اس عرصہ میں ہماری عورتوں اور بچوں کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے بعد تم لکھنؤ یہ خبر بھیج سکتے ہو کہ اس علاقے کی بستیاں خالی ہو چکی ہیں۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "مجھے لکھنؤ اطلاع بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے جو آدمی رات کے وقت بھاگ نکلے ہیں ان میں سے بعض لکھنؤ ضرور پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لکھنؤ کا رخ کرنے کی بجائے میراں پور کٹرہ کے پڑاؤ میں پہنچ جائیں اور وہاں سے فوج کے چند دستے اس طرف روانہ ہو جائیں۔"

"اس صورت میں بھی تمھارے لیے ان کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنا مشکل نہ ہو گا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں یہاں سے زخمیوں، عورتوں اور بچوں کو نکالنے کے لیے دو دن مل جائیں۔"

عبداللہ نے کہا۔ "میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کو دو دن کی بجائے دو ہفتے مل جائیں۔

لیکن اس کے بعد میری منزل لکھنؤ نہیں ہوگی۔ شاید میرے کئی اور ساتھی بھی لکھنؤ جانا پسند نہ کریں۔"

معظم علی نے کہا: "میں ان سب کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا نام معظم علی ہے اور تم مجھے سرنگاپٹم میں آسانی سے تلاش کر سکو گے۔ اکبر خاں! تم گھوڑے تیار کراؤ، اور ان کا تمام اسلحہ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دو۔ صرف عبداللہ کے ہتھیار اور گھوڑا اسے واپس دے دو۔"

عبداللہ نے کہا: "نہیں، اس وقت آپ کو ان چیزوں کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"بہت اچھا! لیکن جانے سے پہلے میں تمھارے ساتھیوں سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی یہ کہہ کر قیدیوں کی طرف بڑھا اور انھیں مخاطب کرتے ہوئے بولا: "تم کسی رحم کے مستحق نہیں ہو۔ تمھارے ہاتھ ان بے گناہوں کے خون سے رنگین ہیں جن کا گناہ صرف یہ تھا کہ ان کے پاس اودھ کے سفاک بے حس اور عیاش حکمران کے خزانے بھرنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ تمھارے حکمران نے روہیلکھنڈ کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹنے کے لیے چالیس لاکھ روپے کے عوض، انگریزوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن تمھیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگریز یہاں اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ تمھارے یا اودھ کے حکمران کے دوست تھے۔ نواب شجاع الدولہ نے انھیں دلی کی طرف چند اور منزلیں طے کرنے کا موقع دیا ہے اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مرہٹے یا تمھارا کوئی اور دشمن اودھ کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے انھی انگریزوں کو چالیس لاکھ سے زیادہ روپیہ پیش کر دے تو تمھارا کیا انجام ہوگا؟ شجاع الدولہ کا خیال ہے کہ اس نے انگریزوں کی اعانت سے اپنی سلطنت کی حدود وسیع کر لی ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تباہی اور بربادی کے سیلاب کو بنگال سے لکھنؤ تک لے آیا ہے۔ روہیلکھنڈ شمالی ہندوستان کا ایک مضبوط ترین قلعہ تھا اور اودھ کے حکمران نے یہ قلعہ توڑ کر ان بیرونی

حملہ آوروں کا راستہ صاف کر دیا ہے جو مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ کاش تم سب انگریز ہوتے اور ہم ضمیر کی ملامت محسوس کیے بغیر تم سب کو اسی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے سکتے جہاں تمھارے انگریز سرپرستوں کی لاشیں لٹک رہی ہیں لیکن یہ لوگ جن کے گھر تم نے راکھ کے ڈھیر بنا دیئے ہیں، انتہائی غم و غصہ کی حالت میں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تم مسلمان ہو۔ تم نے چند ٹکوں کے لیے ان کی عزت اور آزادی پر حملہ کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ جو لوگ تمھارے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں وہ مسلمان ماؤں کے بیٹے، مسلمان بیویوں کے شوہر، مسلمان بہنوں کے بھائی اور مسلمان بچوں کے باپ ہیں۔ تمھارے دشمن یہ لوگ نہیں جنھوں نے پانی پت کے میدان میں اپنی جانوں پر کھیل کر تمھیں مرہٹوں کی غلامی سے بچایا تھا۔ بلکہ تمھارا دشمن وہ کوتا اندیش اور ملت فروش حکمران ہے جو انگریزوں کے ساتھ تمھاری اور تمھارے بعد آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ ہم سب جانتے کہ روہیلکھنڈ میں قیامت آ چکی ہے لیکن میں تمھیں اس دن سے خبردار کرتا ہوں جب تم اس سے بدتر قیامت کے اثرات لکھنؤ کی گلیوں میں دیکھو گے۔

تم آزاد ہو اور تمھیں اس لیے آزاد کیا جاتا ہے کہ ہم تمھیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع دینا چاہتے ہیں ہم تمھیں اس بات کا موقع دینا چاہتے ہیں کہ تم ان ملت فروشوں سے نجات حاصل کر سکو۔ جنھوں نے ان بازوؤں کو کاٹا ہے جو خطرے کے وقت تمھاری مدافعت کے لیے اٹھ سکتے تھے اور ان گھروں کو جلایا ہے جو تمھارے دفاعی حصار بن سکتے تھے۔"

جنگ ختم ہوتے ہی ایک سوار جنگل میں چھپے ہوئے لوگوں کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے تو چار ہزار عورتیں، بچے

اور بوڑھے جنگل سے باہر نکل کر ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بلقیس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ننھا شہباز خاں "اباجان اباجان" کہتا ہوا آگے بڑھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے سے اتر کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر اس نے بلقیس کے قریب جا کر سوال کیا "تنویر کہاں ہے؟"

بلقیس اس کے جواب میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تنویر میرے پاس ہے۔"

اکبر خاں نے شہباز کو نیچے اتار کر تنویر کو اٹھا لیا۔

معظم علی اپنا گھوڑا ایک آدمی کے حوالے کرنے کے بعد آگے بڑھا اور اس نے اکبر خاں کے قریب آ کر کہا۔ "اب سوچنے یا باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیئے۔ آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟"

اکبر خاں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ ہمارے پیدل آنے والے ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں تو سب کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔"

معظم علی نے کہا۔ "تو یہ بہتر ہوگا کہ ہم جنگل میں ان کا انتظار کریں۔"

"بہت اچھا!" اکبر خاں یہ کہہ کر قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "آپ سب جنگل میں اسی جگہ واپس پہنچ جائیں۔ ہمارے باقی آدمی پیدل آ رہے ہیں اور وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد قبیلے کے لوگ جنگل میں بیٹھے اکبر خاں کی تقریر سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا:

"بھائیو اور بہنو! میں اب تمھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس وقت ہم کتنی بڑی تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ میران پور کٹرہ کی جنگ میں ہماری قوم کا بہترین خون بہہ چکا ہے۔ ہماری تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور اب ہمارے پاس آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ کاش الفاظ ان بہنوں اور ماؤں کی تسلی کے لیے کافی ہوتے جن کے بھائی، شوہر اور بیٹے اپنے وطن کی حفاظت پر قربان ہو چکے ہیں۔ کاش الفاظ ان بھیڑیوں کی خصلت بدل سکتے جنھیں انسانوں کے خون کی پیاس روہیلکھنڈ میں لے آئی ہے۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ اس وطن سے نکل جائیں جس کی خاک میں ہمارے اسلاف کی ہڈیاں دفن ہیں۔ یہاں اب انسانوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ نہ معلوم اب روہیلکھنڈ کی کتنی بستیوں میں میری بستی کی داستان دہرائی جائے گی۔ اگر صرف میری ذات کے لیے خطرہ ہوتا تو میں یہاں سے ہجرت کرنا گوارا نہ کرتا لیکن میرے سامنے پورے قبیلے کا مسئلہ ہے۔ میرے سامنے ان یتیم بچوں اور بیوہ ماؤں اور بہنوں کا مسئلہ ہے۔ جن کے باپ اور شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔ انھیں اس ملک میں سر چھپانے کے لیے کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے۔ میرے بزرگ بھائی معظم علی خاں کو اصرار ہے کہ ہم ان کے ساتھ میسور چلے جائیں لیکن جو کچھ میسور کے متعلق میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قلعہ ہے جہاں بہترین سپاہیوں کی ضرورت ہے، حیدر علی کے متعلق میں نے سنا ہے کہ وہ ایک فیاض حکمران ہے لیکن انگریزوں اور مرہٹوں کے خلاف اس کے جنگ کے نتائج کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان بے سہارا عورتوں اور بچوں کے لیے میسور ایک اور روہیلکھنڈ بن جائے۔ بھائی معظم علی مجھ سے ناراض ہوں گے لیکن سر دست میرا یہی فیصلہ ہے کہ ہم میسور کی بجائے حیدر آباد جائیں اور وہاں کسی ایسی جگہ آباد ہونے کے امکانات کا جائزہ لیں جہاں ہمیں قابل کاشت زمین مل سکتی ہو۔ قبیلے کے بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہم یہاں سے دلی، لاہور یا پشاور کا رخ کریں۔ شمال کی طرف کہیں دور نکل جانا ہمارے لیے یقیناً بہتر ہوگا لیکن کاش مجھے اس بات کا اطمینان ہوتا کہ وہاں کسی علاقے کی حکومت اتنے لوگوں کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوگی۔ میری اپنی

رائے سر دست یہی ہے کہ ہم حیدرآباد جائیں۔ تاہم میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کیا جائے۔"

معظم علی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اکبر خاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ تقریر کر کے بیٹھ گیا تو معظم علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ "اکبر خاں میرا خیال تھا کہ آپ میسور جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں اس موضوع پر آپ کے ساتھ علٰحدگی میں بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی ناراضگی دور کر سکوں گا۔"

دوسری بستیوں کے چھوٹے چھوٹے سردار اور قبیلے کے عمر رسیدہ لوگ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ بعض لوگ اکبر خاں کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن بعض انتہائی تشدد کے ساتھ شمال کی طرف ہجرت کرنے کی حمایت کر رہے تھے۔ اکبر خاں کا ایک خالہ زاد بھائی منور خاں جو قبیلے میں اکبر خاں کے بعد سب سے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک تھا، یہ کہہ رہا تھا کہ اس ملک کی کسی ریاست میں ہمارے لیے عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ میرا یہی مشورہ ہے کہ ہم اٹک کے پار کوئی جائے پناہ تلاش کریں۔ یہ نااہل، بدطینت اور سفاک حکمران اس ملک کے لیے ایک لعنت ہیں اور میرے نزدیک اودھ، حیدرآباد اور میسور میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہمارے مقدر میں صرف ذلت اور رسوائی ہے تو ہم یہیں رہ کر اودھ کی غلامی کیوں نہ قبول کر لیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہاں آزادی سے محروم ہونے کے بعد ہماری بقا کو بھی خطرہ ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی اور حکمران کی غلامی ہماری بقا کے لیے خطرناک نہ ہوگی؟"

قبیلے کے ایک اور بااثر آدمی نے اٹھ کر کہا۔ "بھائیو! میری بھی یہی رائے ہے کہ ہم شمال کا رخ کریں لیکن موجودہ حالات میں آپ میں سے ہر شخص اپنے مستقبل کے

متعلق فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے جو لوگ میرے بھائی اکبر خاں کا ساتھ دینا چاہیں ہم انھیں نہیں روکیں گے اور مجھے امید ہے کہ اکبر خاں کے طرفدار بھی ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

یہ بحث ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ بالآخر معظم علی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔ "بھائیو! میں آپ کو میسور آنے کی دعوت دے چکا ہوں لیکن اکبر خاں کے لیے میرا مشورہ قابل قبول نہیں۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں اور جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب بحث کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں جو لوگ شمال کی طرف جانا چاہتے ہیں، میں انھیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں ان کے لیے دعا کروں گا کہ خدا ان کا حامی و ناصر ہو لیکن میری پہلی ذمہ داری ان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش ہے جو اب بے سہارا ہو چکے ہیں اور مجھے یہ اعتماد ہے کہ میں ان کے لیے حیدرآباد پہنچ کر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر وہاں کے حالات اطمینان بخش نہ ہوئے تو میری دوسری منزل میسور ہوگی۔ بہرحال اگر مجھے معلوم ہوا کہ میرے وہ بھائی جو دوسری طرف جانا چاہتے ہیں کوئی تسلی بخش جائے پناہ تلاش کر چکے ہیں تو ہم بھی شاید کسی دن وہاں پہنچ جائیں — منور خاں! تم تیاری کرو اب باتوں کے لیے وقت نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم یہیں سے اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد منور خاں اور اکبر خاں کی قیادت میں دو قافلے مختلف سمتوں کو روانہ ہو رہے تھے۔ ایک کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا اور دوسرے کی منزل مقصود حیدرآباد تھی۔ اکبر خاں کے ساتھ بارہ سو افراد تھے۔ جن میں سے نصف سے زیادہ لاوارث بچے اور بیوہ عورتیں تھیں۔ بلقیس اپنی بچی تنویر کو گود میں لیے ایک گھوڑے پر سوار تھی اور شہباز

دوسرے گھوڑے پر اکبر خاں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی، قافلے کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مسلح آدمیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

کوئی دو کوس چلنے کے بعد اکبر خاں نے اپنا گھوڑا معظم علی کے قریب لے جاکر کہا۔ "بھائی جان آپ مجھ سے خفا ہیں؟ اگر آپ کا حکم ہے تو میں حیدرآباد کی بجائے میسور جانے کو تیار ہوں۔"

"نہیں!" معظم علی نے جواب دیا۔ "میں اب تمھیں میسور جانے کے متعلق نہیں کہوں گا۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "حیدرآباد جانے کے متعلق میرا فیصلہ بلاوجہ نہیں۔ شیخ فخرالدین اور مرزا طاہر بیگ کو ایک مدت سے یہ اصرار تھا کہ میں اپنے خاندان سمیت روہیلکھنڈ چھوڑ کر حیدرآباد میں آباد ہو جاؤں۔ جن دنوں مرہٹوں نے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ حیدرآباد سے شیخ فخرالدین اور ادھونی سے طاہر بیگ کے ایلچی میرے پاس آئے تھے۔ انھوں نے یہ پیغام بھیجے تھے کہ اب روہیلکھنڈ کی بجائے نظام کی سلطنت بہت زیادہ محفوظ ہے۔ اس لیے جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے تم یہاں آجاؤ۔ میں نے انھیں یہ جواب دیا تھا کہ میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں اور میرا مرنا اور جینا ان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد مجھے شیخ فخرالدین کا ایک اور خط ملا۔ انھوں نے یہ لکھا تھا کہ اگر تم چاہو تو حیدرآباد یا ادھونی میں تمھارے تمام قبیلے کو آباد کرنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور میں نے اسے ایک مذاق سمجھا تھا۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے حیدرآباد یا ادھونی کے آس پاس اتنی زمین مل جائے جس میں یہ بے سہارا لوگ امن و چین کے دن گزار سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی بدولت مجھے ایسی جگہ میسور میں بھی مل سکتی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میسور کا مستقبل حیدرآباد کی نسبت کہیں زیادہ مخدوش ہے۔

آپ یہ کہتے ہیں کہ میسور کا حکمران حیدرآباد کے حکمران کی نسبت کہیں زیادہ بیدار مغز، دوراندیش اور بہادر ہے اور اس کے سامنے ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے تلوار اٹھانا ایک نیکی ہے لیکن بھائی جان! اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ اب میں کسی حکمران کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ اب انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ حکمرانوں کی عاقبت اندیشی، نیکی اور شرافت میرے لیے ایک سراب ہے اور مجھ میں اس سراب کے پیچھے دوڑنے کی ہمت نہیں رہی۔ آپ بنگال کی آزادی کے محافظ بن کر میدان میں نکلے تھے لیکن آپ کو کیا حاصل ہوا؟ اور جب میں پانی پت کے میدان میں لڑ رہا تھا تو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس جنگ کے بعد روہیلہ سپاہیوں کو اودھ، دلی اور حیدرآباد کے امرا اپنا محسن خیال کریں گے لیکن ہماری قربانیوں کا جو صلہ ہمیں نواب وزیر اودھ نے دیا ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ ہم ان کے دشمنوں کو کوسوں دور رکھنے کے لیے گئے تھے لیکن انھوں نے کوسوں دور بیٹھ کر ہماری تباہی و بربادی کا تماشا دیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے ایثار و خلوص کے ہر جذبہ سے محروم ہو چکا ہوں جن کی بے حسی کے باعث ہماری بستیاں راکھ کے ڈھیر بن گئی ہیں۔

آپ میرے محسن ہیں۔ آپ نے میری مدد کی ہے اور آپ کے لیے میں اپنے جسم کی بوٹیاں نچوانے کے لیے تیار ہوں لیکن آج سے میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ میری تلوار کسی حکمران کے لیے نہیں اٹھے گی۔ میں ایک کسان بنوں گا۔ میں ایک چرواہا بنوں گا۔ میری زندگی کا اب پہلا اور آخری مقصد ان بے بس لوگوں کی حفاظت اور پرورش ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ حیدر علی نہ صرف میسور بلکہ اودھ اور حیدرآباد کے مسلمانوں کی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہا ہے لیکن یہی وجہ ہے جو میں میسور جانے سے ڈرتا ہوں۔ میں اور میرے قبیلے کے جانبازوں نے بھی ان لوگوں کی بقا اور آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی لیکن ہماری بے لوث قربانیاں ان درندوں کی خصلت نہیں بدل سکیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ احسان فراموش قوم کہیں ہماری طرح حیدر علی کو بھی اپنا دشمن نہ سمجھ لے۔

بھائی جان! میری پونجی میرے جلے ہوئے گھر کی راکھ اور ان بے سہارا لوگوں کے آنسو ہیں۔ میں نظام کے پاس جا کر یہ کہوں گا کہ اگر تمھیں اچھے کسانوں اور اچھے چرواہوں کی ضرورت ہے تو ہمیں اپنی مملکت میں آباد کر لو لیکن اگر یہاں صرف تمھارے اقتدار کے پرچم اٹھانے والے سپاہیوں کی ضرورت ہے تو ہم واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں تمھارے احساسات سے غافل نہیں۔ تم نے ایک بھیانک ترین انقلاب دیکھا ہے لیکن یقین کرو جب میں نے بنگال سے ہجرت کی تھی اس وقت میرے دل میں بھی اسی طرح کے خیالات تھے۔ میں بھی یہ سوچا کرتا تھا کہ میں اب کسی حکمران کے ساتھ سروکار نہیں رکھوں گا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے تجارت شروع کر دی تھی لیکن زمانے کا کوئی انقلاب سلگتی ہوئی آگ سے دھواں اور دہکتے ہوئے انگاروں سے حرارت جدا نہیں کر سکتا۔ میں دعا کروں گا کہ حیدرآباد میں تم امن اور سکون کی زندگی گزار سکو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن میسور ضرور آؤ گے۔ دکن کا سب سے بڑا زمیندار بن جانے کے باوجود تم کسی دن یہ محسوس کرو گے کہ تمھاری آخری منزل سرنگاپٹم ہے۔"

میراں پور کٹرہ کی شکست کے بعد روہیلوں کے سامنے موت یا ہجرت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اودھ کے سپاہی انھیں جنگلی جانوروں کی طرح گھیر گھیر کر قتل کر رہے تھے۔ ان کی بستیاں جلائی جا رہی تھیں۔ آگ اور خون کے اس طوفان سے بچ کر بھاگ نکلنے والے دور دراز علاقوں میں پناہ لے رہے تھے۔

یہ جنگ کسی حکومت یا فوج کے خلاف نہ تھی بلکہ ان انسانوں کے خلاف تھی جن کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ کسی میر جعفر، کسی شجاع الدولہ یا کسی نظام علی خاں جیسے ملت فروش کے اطاعت گزار نہ تھے۔ روہیلکھنڈ کی سرزمین اس شریف، بہادر اور غیور قوم کے فرزندوں کے خون سے لالہ زار تھی اور روہیلکھنڈ سے باہر اس قوم کی بے بسی کے

آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ مہاجرین کے قافلے اپنی جنم بھوم چھوڑ کر پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کا ماضی اجڑی ہوئی بستیوں، بے گور و کفن لاشوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کی داستانوں سے لبریز تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر ایک لاکھ انسان جلاوطنی کی حالت میں غربت، افلاس، قحط اور طرح طرح کی وباؤں کا سامنا کر رہے تھے۔ نواب وزیر اودھ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی سلطنت میں ایک سرسبز و شاداب خطۂ زمین کا اضافہ ہو گیا ہے۔ انگریز خوش تھے کہ ہندوستان کا ایک بازوئے شمشیر زن کٹ چکا ہے اور مرہٹے خوش تھے کہ وہ لوگ جو کسی وقت دلی میں ان کے مدمقابل بن سکتے تھے۔ پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں۔

جو قافلہ معظم علی اور اکبر خاں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ ان گنت مصائب کا سامنا کرنے کے بعد ایک دن حیدرآباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ راستے میں دو مقامات پر ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا لیکن قافلے کے محافظوں کے ساتھ معمولی جھڑپوں کے بعد وہ بھاگ گئے۔ معظم علی کو اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اودھ کی فوج ان کا تعاقب کرے گی لیکن اودھ کی فوج کا سپہ سالار فتح کے جشن میں حصہ لینے کے لیے لکھنؤ پہنچ چکا تھا اور اس کے سپاہی اکبر خاں کی بستی پر حملہ کرنے والے ساتھیوں کے انجام سے بے خبر روہیلکھنڈ کے طول و عرض میں قتل و غارت اور لوٹ مار میں مصروف تھے۔

چار دن بعد جب انگریزی فوج کے افسروں کو اپنے ساتھیوں کے انجام کا پتہ چلا تو یہ قافلہ کئی منزلیں دور جا چکا تھا۔

حیدرآباد کے دارالحکومت سے تین منزل کے فاصلے پر معظم علی نے اکبر خاں سے کہا۔ "میرے دوست اب تمھاری منزل قریب آگئی ہے۔ مجھے بہت جلد سرنگاپٹم واپس پہنچنا چاہیے تھا۔ اب مجھے اجازت دو اور یہ وعدہ کرو کہ اگر حیدرآباد کے حالات تمھاری توقع کے مطابق نہ ہوئے تو تم میرے پاس آجاؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارے خط کا انتظار کروں گا۔"

جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو بلقیس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! بھابی جان کو میرا سلام کہیں۔ میں انھیں دیکھنے کے لیے کسی دن سرنگاپٹم ضرور آؤں گی۔"

معظم علی نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹیا تم ضرور آنا۔ مجھے ڈر ہے کہ حیدر آباد پہنچ کر تم ہمیں بھول جاؤ گے۔"

معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک طرف نکل گئے اور اکبر خاں نے قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔

سرنگاپٹم پہنچ کر معظم علی نے دوبارہ فوجی تربیت گاہ کا انتظام سنبھال لیا۔ مرہٹوں کے ساتھ حیدر علی کی جنگ ابھی تک جاری تھی اور آئے دن میسور کی سلطنت میں نئے نئے مفتوحہ علاقوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک سال تک معظم علی کو اکبر خاں کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملا۔ ایک دن اس نے شیخ فخرالدین کی معرفت اسے خط لکھا۔ قریباً ایک ماہ بعد اسے اکبر خاں کی طرف سے یہ جواب ملا:

"بھائی جان! آپ نے بلقیس کے ماموں جان کی معرفت جو خط لکھا تھا وہ میرے پاس دیر سے پہنچا۔ حیدر آباد پہنچنے کے بعد شیخ فخرالدین کی یہ کوشش تھی کہ میں ان کے ساتھ تجارت میں شریک ہو جاؤں مگر میرے سامنے اپنے قبیلے کے لوگوں کو بسانے کا مسئلہ تھا۔ عطیہ کا خاوند طاہر بیگ میرے لیے ادھونی کی فوج میں ایک عہدے کی پیشکش لے کر آیا تھا لیکن میں اس پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد ہمیں شیخ فخرالدین کی کوشش اور

طاہر بیگ کے اثر و رسوخ کے باعث دریائے کرشنا اور تنگ بھدرہ کے درمیان آباد ہونے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ نہایت سستے داموں میں مل گیا ہے۔ میرے قبیلے کے لوگ اپنے گھر چھوڑتے وقت جو نقدی اپنے ساتھ لائے تھے، وہ ہمارے کام آئی۔ یہ علاقہ مرہٹوں کی مملکت کی سرحد سے صرف چند میل دور ہے۔ ہم نے کچھ زمین ان زمینداروں سے خرید لی ہے جو مرہٹوں کی چھیڑ چھاڑ کے خوف سے ادھونی کے آس پاس آباد ہونا چاہتے تھے۔ باقی زمین سرکاری ہے اور ہمیں اس کے لیے ادھونی کی حکومت کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑا۔ صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اگر مرہٹوں کی طرف سے کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم اپنی حفاظت کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ یہ زمین بہت اچھی ہے لیکن جنگل صاف کر کے اسے قابلِ کاشت بنانے میں ہمیں کچھ عرصہ سخت محنت کرنی پڑے گی۔

شیخ فخرالدین کی کوشش تھی کہ مجھے حیدر آباد کے گرد و نواح میں کوئی جاگیر مل جائے اور وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن مجھے ایک جاگیردار کی حیثیت سے نظام کی فوج کے لیے کرائے کے سپاہی مہیا کرنا منظور نہ تھا۔ ادھونی کی حکومت کے ساتھ میرا یہ معاہدہ ہوا ہے کہ جتنی زمین آباد ہوتی جائے گی ہم اس کا لگان ادا کرتے جائیں گے اور ہم سے کسی وقت سپاہی مہیا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

روہیلکھنڈ کے کئی اور قبیلے ابھی تک اس ملک میں سرگرداں پھر رہے ہیں کوئی پانچ سو آدمی مجھ سے دو ماہ بعد حیدر آباد پہنچے تھے اور میں انھیں یہاں لے آیا ہوں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو ہم دو تین سال کے اندر اندر اس غیر آباد جنگل کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیں گے۔ بھیلوں کے چند قبیلے اس جنگل میں صرف شکار پر گذارہ کرتے تھے لیکن اب ہماری وجہ سے وہ بھی کھیتی باڑی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ میں

بھیل اپنے پاس ملازم رکھ لیے ہیں۔ اب یہ علاقہ ہماری چھوٹی سی دنیا ہے اور ہم اسے بیرونی طوفانوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں اگر سرنگا پٹم آنے کا کوئی خیال تھا تو وہ اب جا چکا ہے۔ اب اگر میں کبھی آؤں گا تو صرف آپ کو دیکھنے کے لیے۔ بلقیس آپ کو اور بھابی جان کو سلام کہتی ہے۔"

آپ کا بھائی اکبر"

اپنی نئی جائے پناہ سے یہ اکبر خاں کا پہلا اور آخری خط تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں دوست اپنی اپنی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہے اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ دوسرے کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

اٹھارھواں باب

چھ سال اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں میسور کے سینکڑوں نوجوان سرنگا پٹم کے فوجی مدرسہ سے تربیت حاصل کر کے حیدر علی کی فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ معظم علی کے بیٹوں نے تلواروں کی جھنکار میں آنکھ کھولی تھی اور انھوں نے اس ماں کا دودھ پیا تھا جسے اپنے اور اپنے شوہر کے خاندان کی غیرت و شجاعت پر ناز تھا۔ یہ بچے ہوش سنبھالتے ہی جنوں، بھوتوں اور سانپوں کی کہانیاں سننے کی بجائے جنگوں کے واقعات سنا کرتے تھے اور بڑے ہو کر وہ اپنے باپ کی مجلس میں حیدر علی کی فوج کے نامور سپہ سالاروں اور بڑے بڑے افسروں کو دیکھا کرتے تھے۔ صدیق علی سترہ سال کی عمر میں سرنگا پٹم کے فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر جہاز رانی کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے اپنے فرانسیسی اتالیق کے ساتھ منگلور جا چکا تھا۔ مسعود علی، انور علی اور مراد علی فوجی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے۔ معظم علی اپنے تمام بچوں کو بہترین سپاہی اور بہترین عالم دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر پر عربی اور فارسی کے علوم کی تعلیم دینے کی خدمت ایک ایرانی عالم کے سپرد کر رکھی تھی اور وہ خود بھی فرصت کے اوقات ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کیا کرتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں انگریزوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک معمولی کلرک سے لے کر گورنر جنرل تک لوٹ مار میں مصروف تھے۔ بنگال کے شہروں کی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ خوشحال تاجروں

کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا کر ترکِ وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میر جعفر کی ذلیل خدمات کا اس کے پسماندگان کو یہ صلہ دیا گیا کہ وارن ہیسٹنگز نے ڈرا دھمکا کر ان سے لاکھوں روپے وصول کیے۔ بنگال کے ایک عالی نسب اور جرأت مند برہمن نند کمار نے وارن ہیسٹنگز کی لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کی اور وارن ہیسٹنگز نے اس کے بدلے نند کمار کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ کھڑا کر کے اسے موت کی سزا دلوا دی۔

بنگال کے امرا کو جی بھر کر لوٹنے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے بنارس کے راجہ چیت سنگھ کی طرف توجہ کی۔ راجہ چیت سنگھ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنے خزانے خالی کر دیے لیکن اس کے پاس وارن ہیسٹنگز اور کمپنی کے دوسرے ملازمین کی بھوک کا کوئی علاج نہ تھا۔ جوں جوں بنارس کے خزانے خالی ہوتے جا رہے تھے وارن ہیسٹنگز کے مطالبات بڑھتے جا رہے تھے، بالآخر جب راجہ کے پاس کچھ نہ رہا تو ہیسٹنگز اس پر حکم عدولی کا الزام عائد کر کے خود بنارس پہنچا اور اس نے راجہ چیت سنگھ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ اُن لیند راجہ نے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے پیش کر دیا لیکن بنارس کی فوج اور عوام اپنے راجہ کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور راجہ کو ان کی قید سے چھڑا لیا۔ ہیسٹنگز بنارس سے بھاگا اور اس نے ایک بڑی فوج جمع کر کے دوبارہ چڑھائی کی۔ راجہ چیت سنگھ اپنی جان اور عزت کے خوف سے گوالیار کی طرف بھاگ گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے چیت سنگھ کی جگہ اس کے بھتیجے کو گدی پر بٹھا دیا اور اپنا خراج سوا دو لاکھ سے بڑھا کر چار لاکھ پاؤنڈ کر دیا۔

نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اودھ کی حکومت اس کے بیٹے آصف الدولہ کے ہاتھ آئی۔ روہیلکھنڈ پر قبضہ کرنے کے لیے وارن ہیسٹنگز سے مدد لینے کے باعث شجاع الدولہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقروض ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ کے گدی پر بیٹھتے ہی وارن ہیسٹنگز نے اس سے پندرہ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ آصف الدولہ

کے پاس روپیہ نہ تھا لیکن اس نئے برٹش ریذیڈنٹ کی مدد سے اپنی بیوہ ماں اور دادی سے ساڑھے پانچ لاکھ پاؤنڈ کی رقم اس شرط پر حاصل کی کہ اس کے بعد وہ یا انگریز ان سے کوئی اور مطالبہ نہیں کریں گے لیکن وارن ہیسٹنگز کے کانوں تک بیگماتِ اودھ کی دولت کے قصے پہنچ چکے تھے اور وہ روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ جائز سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے آصف الدولہ اور لکھنؤ کے انگریز رزیڈنٹ کو بیگماتِ اودھ سے مزید روپیہ حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جب آصف الدولہ ایک حد سے آگے جانے کے لیے تیار نہ ہوا تو ہیسٹنگز نے انگریز ریذیڈنٹ کو یہ حکم دیا کہ وہ انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ فیض آباد بھیج کر بیگمات کے محلات کا محاصرہ کر لے اور انھیں ہر ممکن اذیت پہنچا کر روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ انگریز ریذیڈنٹ مڈلٹن نے جب بیگمات سے مزید روپیہ حاصل کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تو وارن ہیسٹنگز نے اس مقصد کے لیے اس کی جگہ برسٹوف نامی ایک نیا ریذیڈنٹ بھیج دیا۔ نئے ریذیڈنٹ نے بیگمات کے محل کا محاصرہ کرنے کے بعد ان کے نوکروں کو حراست میں لے لیا اور خفیہ خزانے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے چند ماہ تک ان پر بے پناہ مظالم توڑتا رہا۔ چند سال قبل شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ کی غیرت، عزت اور آزادی پر حملہ کیا تھا اور اب یہی انگریز اس کے اپنے حرم تک پہنچ چکے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں اور اودھ کی شہزادیاں قیدیوں کی سی حالت میں اپنے ان نوکروں اور خادماؤں کی چیخیں سنا کرتی تھیں جنھیں انگریز سپاہی خفیہ خزانے کا راز معلوم کرنے کے لیے صبح و شام زدوکوب کیا کرتے تھے۔ بالآخر جب قریباً ایک سال بدترین اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بیگمات نے سب کچھ انگریزوں کے حوالے کر دیا تو ان کی خلاصی ہوئی۔

شاہ عالم ثانی جو چند سال قبل انگریزوں کی سرپرستی سے نکل کر مرہٹوں کی سرپرستی میں دلی کے تخت پر رونق افروز ہوا تھا اور جسے شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی سلطنت

کا نیا حدود اربعہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے، ایک خاموش، بے بس، تماشائی کی حیثیت میں یہ تمام واقعات دیکھ رہا تھا:

جنوبی ہندوستان میں کرناٹک کے حالات بنگال، اودھ اور بنارس سے بھی بدتر تھے۔ محمد علی والا جاہ بظاہر کرناٹک کا حکمران تھا لیکن درحقیقت وہ ایک ایسا کولھو تھا جس سے انگریز اہلِ کرناٹک کا خون نچوڑنے کا کام لے رہے تھے۔ والا جاہ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ انگریز میسور فتح کریں اور پھر اس کے بعض حصے ارکاٹ کی سلطنت میں شامل کر دیئے جائیں تاکہ انگریزوں کے دسترخوان کے بچے ٹکڑوں سے اُن بیگمات اور شہزادوں کی پرورش کا بہتر انتظام ہو سکے جن کی تعداد اب درجنوں تک پہنچ چکی تھی۔

نیکی اور شرافت کا منہ نوچا جا رہا تھا۔ انسانوں کی تقدیر درندوں کے ہاتھ میں تھی۔ کرناٹک کے تباہ حال لوگ کسی نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔ قدرت کی انتقامی قوتیں حرکت میں آئیں۔ ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور کرناٹک میں انا ولا غیری کا نعرہ لگانے والے انگریز اس کے دہانے پر کھڑے تھے — یہ حیدر علی تھا جو ایک آتشیں سیلاب کے ساتھ میسور سے نکلا اور کرناٹک پر چھا گیا۔ سات سمندر پار سے آنے والے وہ تاجر جو اپنی عیاری اور مکاری کی بدولت ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس سیلاب کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ وہ جو اپنی توپوں کی دھنا دھن کے جواب میں بے بس انسانوں کی چیخیں سننے کے عادی تھے اب ایک ایسی قوم کے جوانوں کی غیرت کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے جو ان کے اندازوں کے مطابق مفلوج ہو چکی تھی اور وہ جو اس ملک کے نااہل امراء کی ملت فروشی اور ابن الوقتی کو اپنی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت خیال کرتے تھے، حیدر علی کے دائیں بائیں وقت کے بہترین جرنیل دیکھ رہے تھے وہ انگریز

سیاست دان جنھوں نے چند سال قبل صرف اس امید پر معاہدۂ مدراس کی شرائط کی خلاف ورزی کر کے حیدر علی کو مرہٹوں کے خلاف تنہا چھوڑ دیا تھا کہ مرہٹے اپنی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر میسور کو فتح کریں گے اور وہ ان سے اپنا حصّہ وصول کر سکیں گے، اپنے سامنے ان نوّے ہزار سواروں کی فوج دیکھ رہے تھے جو انھیں سمندر کی طرف دھکیلنے کے ارادے سے میدان میں آ چکی تھی۔ مدراس کے گورنر نے اس صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے لیے کمپنی کے لشکر کی قیادت بکسر کے فاتح سر ہیکٹر منرو کو سونپی اور کرنل بیلی کو حکم بھیجا کہ وہ گنتور سے اپنی فوج کے ساتھ پیشقدمی کر کے سر ہیکٹر منرو کے ساتھ آ ملے۔

جنرل منرو مدراس سے روانہ ہوا اور کنجی ورم پہنچ کر کرنل بیلی کا انتظار کرنے لگا۔

حیدر علی نے شہزادہ ٹیپو کو کرنل بیلی کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا اور خود ارکاٹ کا محاصرہ چھوڑ کر کنجی ورم کی طرف بڑھا۔ ٹیپو نے کرنل بیلی کے لشکر کو کنجی ورم سے پندرہ میل کے فاصلے پر جا لیا اور پہلی جھڑپ میں اس کے دو سو سپاہی ہلاک کر دیئے۔

اس عرصہ میں ٹیپو کی مدد کے لیے سپاہیوں کے چند دستے پہنچ گئے اور کرنل بیلی نے سر منرو کو پیغام بھیجا کہ وہ فوری مدد کے بغیر ٹیپو کا محاصرہ توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ۹ ستمبر کو سر منرو نے کرنل بیلی کی مدد کے لیے ایک ہزار سپاہیوں کی کمک بھیجدی اور اسی رات نے اس نے کنجی ورم کی طرف کوچ کر دیا لیکن ٹیپو کی فوج نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کنجی ورم سے نو میل کے فاصلے پر کرنل بیلی نے اپنی فوج کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ اسے یہ امید تھی کہ صبح تک منرو بذاتِ خود اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن صبح ہوتے ہی ٹیپو کی فوج نے عقب سے اس پر گولہ باری شروع کر دی اس کے ساتھ ہی حیدر علی کنجی ورم کا رُخ کرنے کی بجائے ٹیپو کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ کرنل بیلی نے مایوسی کی حالت میں پیشقدمی شروع کی لیکن وہ عقب سے توپوں کی گولہ باری اور بازوؤں سے میسور کے سواروں کے حملوں کے باعث ہر قدم پر سخت تباہی کا سامنا کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے

انتہائی مجبوری کی حالت میں کنجی ورم سے چھ میل کے فاصلے پر جم کر لڑنے کا فیصلہ لیا، لیکن اتنی دیر میں ٹیپو کی مدد کے لیے حیدر علی کا توپ خانہ بھی پہنچ چکا تھا۔ توپوں کی دوطرفہ گولہ باری کے باعث انگریزوں کی فوج میں افراتفری مچ گئی۔ ان کی فوج کے دیسی سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور یورپین سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سر ہیکٹر منرو کرنل بیلی کی شکست سے اس قدر بدحواس ہوا کہ وہ اپنی بھاری توپیں ایک تالاب میں پھینک کر مدراس کی طرف بھاگ نکلا۔ ٹیپو کے طوفانی دستے اس کے پیچھے تھے۔ منرو قدم قدم پر لاشیں چھوڑتا ہوا انتہائی بے سروسامانی اور بیچارگی کی حالت میں مدراس پہنچا۔ مدراس کے باشندے بکسر کے فاتح کو اس حالت میں دیکھ کر قہقہے لگا لگا رہے تھے۔

شہزادہ ٹیپو، منرو کی فوج کا جنگی سامان اور رسد کے ذخیرے چھیننے کے بعد دوبارہ اپنے باپ سے جا ملا۔ میسور کا لشکر کرناٹک کے دارالحکومت ارکاٹ کی طرف بڑھا اور محمد علی والاجاہ اپنے انگریز سرپرستوں سمیت وہاں سے بھاگ نکلا اور ماہ اکتوبر ۱۷۸۰ء میں ارکاٹ پر حیدر علی کی فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

حیدر علی ارکاٹ کو اپنا مستقر بنا کر مفتوحہ علاقوں کے انتظامات میں مصروف ہوگیا اور ٹیپو نے دس ہزار سواروں کے ساتھ پیشقدمی کر کے ست گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا اور دو ہزار سپاہی، جن کے پاس کئی مہینوں کے لیے اسلحہ بارود اور رسد کے ذخیرے موجود تھے، اس کی حفاظت پر متعین تھے لیکن قلعہ کے محافظ نے شہزادہ ٹیپو کے پے در پے حملوں سے بدحواس ہو کر ۱۳ جنوری ۱۷۸۱ء کو ہتھیار ڈال دیئے اس کے بعد ٹیپو نے انبور کے قلعہ پر حملہ کیا۔ اس قلعے کا محافظ ایک انگریز کیپٹن کیپٹن تھا۔ وہ قریباً پندرہ دن تک حملہ آور فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہتھیار ڈال دیئے۔

کرناٹک کے ان دو اہم قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد شہزادہ ٹیپو نے تیاگڑھ کی طرف پیش قدمی کی۔ چار ہفتوں کے محاصرہ کے بعد جب اس کی فوج تیاگڑھ کے قلعے پر فیصلہ کن حملہ کر چکی تھی انگریز کمانڈنٹ نے فصیل پر صلح کے جھنڈے بلند کر دیئے۔ ٹیپو نے فوج کی گولہ باری بند کر دینے کا حکم دیا لیکن اگلے دن جب انگریز کمانڈنٹ قلعہ خالی کرنے والا تھا اسے یہ اطلاع ملی کہ سر آئر کوٹ ایک کمک کے ساتھ پہنچنے والا ہے اور اس نے قلعہ خالی کرنے کی بجائے میسور کی فوج پر گولہ باری شروع کر دی۔ جنگ دوبارہ شروع ہوگئی لیکن چند دن بعد قلعے کے محافظوں کو معلوم ہوا کہ سر آئر کوٹ چند منازل دور پڑاؤ ڈالے رسد کا انتظار کر رہا ہے۔ انگریز کمانڈنٹ نے دوبارہ قلعہ خالی کرنے کی پیشکش کی لیکن ٹیپو نے اسے کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا اور ایک شدید حملے کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔

اب کرناٹک کے مضبوط ترین قلعے فتح ہو چکے تھے اور ٹیپو کی فوج کسی دقّت کا سامنا کیے بغیر چھوٹے چھوٹے قلعوں اور چوکیوں سے دشمن کا صفایا کر رہی تھی۔ جون کے مہینے میں شہزادہ ٹیپو شاندار فتوحات کے بعد ارکاٹ پہنچا تو حیدر علی نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ یہ صرف ایک حکمران کی طرف سے اپنے ولی عہد کا استقبال نہ تھا بلکہ ایک اولوالعزم سپہ سالار کی طرف سے اپنی فوج کے اس نوعمر جرنیل کا خیر مقدم تھا جس کی قابلیت اور بہادری کی داستانیں سات سمندر پار تک پہنچ چکی تھیں۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں حیدر علی اس بوڑھے عقاب کی مانند تھا جو نشیمن سے اپنے نوعمر بچے کی پرواز دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کے نقشے پر ایک عظیم سلطنت کی حدود کی لکیریں کھینچ دی تھیں اور اس کا ولی عہد اس سلطنت کے خاکے میں نئے نئے رنگ بھر رہا تھا۔ حیدر علی کے آزمودہ کار جرنیل ہر میدان میں ٹیپو کی قیادت کو فتح کی ضمانت سمجھتے تھے۔ کرناٹک کی جنگ کے دوسرے سال میسور کے اس اولوالعزم حکمران کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ جس کی جوانی کے بیشتر ایام تلواروں

کی چھاؤں میں گزرے تھے۔ اب اس کے لیے زندگی کی آخری خوشی یہ تھی کہ کسی حکمران کو ٹیپو سے بہتر جانشین نہیں مل سکتا۔

ٹیپو، کرنل بیلی اور جرنیل منرو کے بعد سر آئرکورٹ اور اسٹورٹ جیسے جہاندیدہ جرنیلوں سے اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ ارکاٹ میں انگریزوں کی قوتِ مدافعت کچلنے کے بعد وہ تنجور کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے انگریزوں کی افواج بھیڑوں کی طرح بھاگ رہی تھیں۔ کرنل بریتھ ویٹ جسے اپنی توپوں کے بل بوتے پر کئی ہفتے مقابلہ کرنے کی امید تھی، ۲۶ گھنٹوں کے بعد اپنی تلوار پھینک چکا تھا۔

بریتھ ویٹ کو شکست دینے کے بعد ٹیپو نے کسی دقّت کا سامنا کیے بغیر تنجور کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۷۸۲ء کے آخری دنوں میں حیدر علی کی ہدایت پر ٹیپو تنجور سے پوالونود کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے فرانسیسی دستوں کو ساتھ لے کر پیشقدمی کی اور کڈلور پر قبضہ کر لیا۔ مئی کے مہینے ٹیپو کی فوج اور فرانسیسی دستوں نے حیدر علی کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر پانڈی چری کے شمال مغرب میں پرموکل کے پہاڑی قلعے پر حملہ کر دیا۔ جنرل آئرکوٹ نے قلعے کی محافظ فوج کو مدد دینے کے لیے پیشقدمی کی لیکن وہ ابھی کرنگلی پہنچا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ میسور کی فوج قلعے پر قبضہ کر چکی ہے۔ جنرل آئرکوٹ نے میسور کی افواج کے رسد اور بارود کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی نیت سے ارنی کا رخ کیا لیکن حیدر علی نے انگریزوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملتے ہی ٹیپو کو ان کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ دو جون کی صبح جنرل آئرکوٹ کی فوج ایک طرف ٹیپو کے لشکر اور فرانسیسی دستوں کی گولہ باری کا سامنا کر رہی تھی۔ دوسری طرف حیدر علی یلغار کرتا ہوا ان کے عقب سے حملہ آور ہوا۔ جنرل آئرکوٹ کی فوج بھاری اسلحہ اور رسد کی گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ سر آئرکوٹ جس تیز رفتاری سے میسور کے خلاف قوت آزمائی کے لیے آیا تھا اس سے کہیں زیادہ رفتار سے واپس مدراس کا رخ کر رہا تھا:

○

جنگ کے زمانے میں معظم علی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ فوجی تربیت گاہ کے نگران کی حیثیت میں سلطنتِ خداداد کی ایک اہم ضرورت پوری کر رہا ہے۔ فوجی تربیت گاہ کی نگرانی کے علاوہ سرنگاپٹم کے قلعے کی توسیع اور نئے مورچوں کی تعمیر کا کام بھی اسے سونپا جا چکا تھا۔ اس کے پاس ان نوجوانوں کے خطوط آتے جو فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میسور کی فوج میں شامل ہو کر دشمن کے خلاف مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ تاہم وہ بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ میدان جنگ سے دور ہے۔ اس کا بڑا بیٹا صدیق علی میسور کے ایک جنگی جہاز کا کپتان بن چکا تھا اور معظم علی کو اس کے متعلق نہایت حوصلہ افزا خبریں مل رہی تھیں۔ اس سے چھوٹا مسعود علی فارغ التحصیل ہونے کے بعد بری فوج میں شامل ہو چکا تھا۔

جنگ کے دوسرے سال معظم علی فارغ التحصیل طلبا کے سامنے الوداعی تقریر کر رہا تھا جن میں اس کے تیسرے بیٹے انور علی کا نام سر فہرست تھا۔ اس نے کہا:

"میرے عزیزو! مجھے تمھاری خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ تم نے اس سرزمین میں جنم لیا ہے جہاں عزت کی زندگی اور عزت کی موت کے راستے کھلے ہیں۔ تم اس حکمران کی فوج کے سپاہی بننے جا رہے ہو جس کی نگاہیں اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کر سکتی ہیں۔ تم اس دور کے بہترین جرنیلوں کی رہنمائی میں جوانمردی کے جوہر دکھا سکو گے۔ میرے بال اب سفید ہو چکے ہیں لیکن ایک زمانہ تھا جب میری رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑتی تھیں۔ جوانی میں میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں کسی رجلِ عظیم کی فتوحات میں حصہ دار بنوں لیکن میں نے ایسی سرزمین میں آنکھ کھولی تھی جہاں آزادی کے پرستاروں کے لیے قید خانوں کی تاریک کوٹھڑیاں تھیں اور محبانِ قوم و وطن کے لیے پھانسی کے پھندے تھے جہاں قوم کے شہیدوں کی لاشوں کو پیروں تلے روندا جاتا تھا اور ملت فروشوں

کے لیے حکومت کی مسندیں سجائی جاتی تھیں۔

لیکن تمھیں قدرت نے ان سپہ سالاروں کی قیادت میں لڑنے کا موقع دیا ہے جن کے گھوڑوں کی رکھوالی کرنا بھی میرے نزدیک ایک سعادت ہے۔ میں شہزادہ فتح علی کی فتوحات کے متعلق سنتا ہوں تو میرے دل میں باربار یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں یہاں پیدا ہوتا۔ میرا بچپن میری جوانی اور میرا بڑھاپا ان کے ساتھ گزرتا۔ ایک قافلے کی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا امیر اپنے راستے کے نشیب و فراز پر نگاہ رکھتا ہے اور ایک سپاہی کے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا سپہ سالار کسی مقصد کے لیے قربانی دینا جانتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تمھاری جرأت اور ہمت نواب حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو کے بلند عزائم کا ساتھ دے سکے اور میں اس بات پر فخر کر سکوں کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

ایک ہفتہ بعد انور علی، حیدر علی کے نامور جرنیل غازی کی قیادت میں محاذِ جنگ کو روانہ ہو چکا تھا اور اس کی کمان میں پچاس سوار تھے۔ اس کے بعد گھر میں معظم علی اور فرحت کی تمام دلچسپیاں ننھے مراد تک محدود ہو گئیں۔ مراد علی اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ اس کی شوخیاں اور اس کی شرارتیں اس کے والدین، بھائیوں، نوکروں اور پڑوسیوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہتی تھیں لیکن جب تینوں بھائی یکے بعد دیگرے گھر سے چلے گئے تو اسے اپنی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ بھائیوں کی موجودگی میں وہ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد باقی سارا دن کھیل کود میں گزارتا تھا لیکن وہ فرصت کے لمحات میں ہمیشہ ماں کے پاس رہنا پسند کرتا تھا۔

معظم علی کے بیٹے بڑی باقاعدگی کے ساتھ اسے خطوط بھیجا کرتے تھے۔ ان خطوط میں مراد علی کے متعلق اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں: "اس کی صحت کیسی ہے — اب بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتا ہے یا کچھ سنجیدہ ہو گیا ہے — محلے کے لڑکوں کے ساتھ

اس کی جنگیں ختم ہوئیں یا نہیں — صابر کے ساتھ اب بھی جھگڑا ہوا کرتا ہے یا نہیں — وہ بہت یاد آتا ہے۔" اور فرحت اپنے بیٹوں کو جواب میں لکھا کرتی تھی: "مراد علی اب بہت بدل گیا ہے — اس کی شوخیاں تمھارے ساتھ رخصت ہو چکی ہیں — وہ میری تنہائی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور مکتب سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آجاتا ہے — فوجی تربیت حاصل کرنے اور کتابیں پڑھنے کے علاوہ اس کی تمام دلچسپیاں جنگ کی خبریں سننے تک محدود ہو چکی ہیں۔"

○

ایک دوپہر معظم علی، فرحت اور مراد مکان کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مکان کے مردانہ حصے کی طرف گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد صابر بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلایا: "صدیق علی خاں آگئے۔"

معظم علی اور فرحت کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے اور مراد علی "بھائی جان، بھائی جان!" کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے بعد معظم علی اور فرحت کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔ صدیق علی مراد کو اپنے ساتھ چمٹائے صحن میں داخل ہوا اور اس نے اپنے والدین کو سلام کیا۔ اس کے سر پر پگڑی کی بجائے سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ فرحت اضطراب اور بدحواسی کی حالت میں چند قدم آگے بڑھ کر بولی: "بیٹا کیا ہوا تم نے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

"امی جان میں زخمی ہو گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ زخم بہت معمولی تھا۔ گولی میری کھوپڑی کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔"

مراد علی نے کہا۔ "امی جان! آپ نے غور نہیں کیا، بھائی جان لنگڑا بھی رہے تھے!"

صدیق علی نے کہا۔ "مراد تم بہت شریر ہو۔ امی جان آپ پریشان نہ ہوں گھوڑے پر سفر کرتے کرتے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "بیٹا چلو اندر بیٹھو! صابو خادمہ سے کہو ان کے لیے کھانا لے آئے۔"

صدیق علی ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور معظم علی نے اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے توقع نہ تھی کہ آج کل تمہیں گھر آنے کی چھٹی ملے گی۔"

"ابا جان! میں صرف دو دن یہاں ٹھہروں گا۔"

"تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"

"ابا جان! میں سیدھا کالی کٹ سے آرہا ہوں۔ میں ماہی کے قریب بحری جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔ میرے جہاز پر دو انگریزی جہازوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک کو ہم نے غرق کر دیا لیکن دوسرے جہاز کی گولہ باری سے ہمارے جہاز کو آگ لگ گئی۔ ایک فرانسیسی جہاز بروقت ہماری مدد کے لیے پہنچ گیا اور اس نے انگریزی جہاز کو بھگا دیا۔ ہمیں اپنے جلتے ہوئے جہاز سے سمندر میں کودنا پڑا۔ فرانسیسی ملاحوں نے ہمیں سمندر سے نکال کر اپنے جہاز میں کالی کٹ پہنچا دیا۔ میرے زخم معمولی تھے۔ تاہم مجھے چند دن آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ ابھی چھ سات روز گزرے تھے کہ انگریزوں نے اچانک تیلی چری اور ماہی پر قبضہ کر کے کالی کٹ پر حملہ کر دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کارگزاری کے متعلق آپ کے لیے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں لایا ہوں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جن دو آدمیوں نے سب سے آخر میں کالی کٹ کا قلعہ چھوڑا تھا ان میں سے ایک قلعے کا محافظ اور دوسرا میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری فوج بہت جلد پہنچ جائے گی اور ہم کسی تاخیر کے بغیر انگریزوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔ مسعود اور انور کے متعلق کوئی خبر آئی ہے؟"

"ہاں وہ بخیریت ہیں۔ انور ان دنوں تبجوز پہنچ چکا ہے اور مسعود، حیدر علی کے

ساتھ ہے۔ کچھ عرصہ سے میں بھی یہ کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے کسی محاذ پر بھیج دیا جائے۔ میں نے شہزادہ ٹیپو کو درخواست بھیجی تھی لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "نہیں ابا جان! اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "مجھ سے زیادہ حیدر علی کو آرام کی ضرورت تھی۔"

"لیکن ابا جان اگر آپ جنگ پر چلے گئے تو یہاں آپ کے حصے کا کام کون سنبھالے گا؟"

"یہاں میری جگہ لینے والے اب کئی لوگ موجود ہیں۔"

تیسرے دن صدیق علی اپنے والدین اور اپنے ننھے بھائی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا

* * *

ایک رات آسمان صاف تھا۔ معظم علی، فرحت اور مراد علی نماز مغرب کے بعد کھلے صحن میں بیٹھے خوشگوار ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ صابر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب آیا اور اس نے کہا۔ "اسد خاں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اسد خاں، معظم علی کے انتہائی بے تکلف دوستوں میں تھا اور اسے چند سال قبل ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد سرنگاپٹم میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کا ناظم بنا دیا گیا تھا۔

معظم علی نے صابر سے پوچھا۔ "ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"جی نہیں۔"

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم اوپر چلی جاؤ میں انھیں یہیں بلا لیتا ہوں۔"

فرحت اٹھ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد صابر، اسد خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔ معظم علی نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے

پوچھا۔ "کیا بات ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟"

اسدخاں نے جواب دیا۔ "مجھے اسی وقت ارکاٹ پہنچنے کا حکم ملا ہے۔ حیدرعلی نے سرنگاپٹم کے چند اور افسر بھی اپنے پاس بلا لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ پرسوں مجھے برہان الدین کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "آپ کب جا رہے ہیں؟"

"میں ابھی روانہ ہوجاؤں گا۔ میں صرف آپ سے الوداع کہنے کے لیے آیا تھا۔"

معظم علی نے کہا۔ "خدا انھیں صحت دے۔ اس وقت حیدرعلی کی صحت سے زیادہ میسور کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔"

اسدخاں نے کہا۔ "آپ اپنے لڑکوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "حیدرعلی کے کیمپ میں شاید آپ کو مسعود علی کے سوا کوئی اور نہ ملے۔ صدیق علی ان دنوں منگلور میں ہوگا اور انور علی نے مجھے پچھلے ہفتے یہ اطلاع بھیجی تھی کہ مجھے تجوز بھیجا جا رہا ہے۔ اگر مسعود علی ملے تو اس سے یہ کہیں کہ گھر سب خیریت ہے۔"

مراد علی نے کہا۔ "چچا جان! بھائی جان سے یہ بھی کہیں کہ وہ چھٹی لے کر چند دن کے لیے گھر ضرور آئیں۔ امی انھیں بہت یاد کرتی ہیں۔"

معظم علی نے کہا "میں نے شہزادہ ٹیپو کو پچھلے ہفتے ایک خط لکھا تھا۔ انھوں نے مجھے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ ان کے ساتھ کافی بے تکلف ہیں اگر ممکن ہو تو میرے خط کا ذکر ضرور کریں۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔"

اسدخاں نے اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے ضرور

کہوں گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ شہزادہ ٹیپو اشد ضرورت کے بغیر آپ کو کسی محاذ پر بھیجنا گوارا نہیں کریں گے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ سرنگاپٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔"

اسدخاں باہر نکل گیا تو مراد علی نے کہا۔ "ابا جان آپ مجھے کب لڑائی پر بھیجیں گے؟"

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا جب تم سپاہی بننے کے قابل ہوجاؤ گے تو تمھیں مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

مراد علی نے کہا۔ "ابا جان میں یہ سوچتا ہوں کہ جب میں بڑا ہوں گا تو جنگ ختم ہوجائے گی۔ پھر ہم لوگ کیا کریں گے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "بیٹا! جب جنگ ختم ہوجائے گی تو تم ایک آزاد اور باعزت قوم کے معمار ہوگے۔ تم ان شہروں اور بستیوں کو دوبارہ آباد کروگے جو ہماری عزت اور آزادی کے دشمنوں کے ہاتھوں ویران ہوچکی ہیں۔ تمھارے سامنے نہریں کھودنے اور بنجر زمینیں آباد کرنے کا کام ہوگا۔ بیٹا تم یہ دعا کیا کرو کہ تمھارے بھائی فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے گھر واپس آئیں اور تمھارے مقدر میں جنگ کی کلفتوں کی بجائے فتح کے انعامات ہوں۔"

* * *

میسور کی افواج ارکاٹ سے چند میل دور شمال کی طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ حیدرعلی علالت کے باعث ایک خیمے میں لیٹا ہوا تھا۔ ٹیپو ملیبار کی مہم پر روانہ ہونے والے لشکر کی صفوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے باپ کو خدا حافظ کہنے کے لیے خیمے میں داخل ہوا۔ حیدرعلی کے اشارے سے طبیب اور تیماردار باہر نکل گئے اور اس نے ٹیپو کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "فتح علی بیٹھ جاؤ! آج میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ٹیپو اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور حیدرعلی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بیٹا تم ایک نہایت اہم مہم پر جا رہے ہو۔ ملیبار کی بندرگاہوں کو انگریزوں کے قبضے سے

چھڑانا ضروری ہے۔ جنگ کے متعلق اب میں تمھیں کوئی نصیحت نہیں کرسکتا۔ مجھے تمھاری غیرت، تمھاری شجاعت اور تمھاری ذہانت پر فخر ہے۔ ملک کی حکومت اور سیاست کے بارے میں تمھیں میری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ان پڑھ آدمی ہوں لیکن تم اس ملک کے چوٹی کے علماء کی صفِ اول میں کھڑے ہوسکتے ہو۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میرا بیٹا اپنے زمانے کا بہترین سپاہی، بہترین عالم اور بہترین حکمران ثابت ہو اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری یہ خواہش پوری کردی لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔ ۔ ۔ ۔"

حیدر علی یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا اور ٹیپو نے کہا۔ "ابا جان اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو آپ کو بتانے میں جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی اصلاح کروں گا۔"

حیدر علی نے جواب دیا۔ "نہیں بیٹا! تم نے ہمیشہ میری بلند ترین توقعات پوری کی ہیں۔ مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ میں اپنے حصے کا کام پورا نہ کرسکا۔ میں اپنی موت سے پہلے ہندوستان کو انگریزوں سے پاک دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہو۔"

ٹیپو نے مغموم لہجے میں کہا۔ "ابا جان آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔"

حیدر علی نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ٹیپو! ممکن ہے کہ میں چند دن تک تندرست ہوجاؤں اور تمھاری مدد کے لیے ملیبار پہنچوں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ اس لیے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، غور سے سنو۔ میری زندگی کی دوسری ناکامی یہ ہے کہ میں نظام اور مرہٹوں کو راہِ راست پر نہ لا سکا۔ انگریز ہمارے اس لیے دشمن ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مرہٹے ہمارے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کو اپنی شکارگاہ سمجھتے ہیں اور انھیں کسی دوسری

طاقت کا ابھرنا گوارا نہیں۔ نظام ہمارا ایک طاقت ور حلیف بن سکتا تھا لیکن وہ ان ابن الوقتوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے جنھیں ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ فرانسیسی اس وقت بیشک ہمارے ساتھ ہیں لیکن ہمیں یہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ ہمیشہ ہمارے دوست رہیں گے۔ وہ محض اپنی انگریز دشمنی کے باعث ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہیں لیکن اگر کسی وقت انگریزوں کے ساتھ ان کی مصالحت ہوگئی تو وہ ہمیں تنہا چھوڑ دیں گے۔ محمد علی کی حیثیت اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں اس کی دوستی یا دشمنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ انگریزوں کی بساطِ سیاست کا ایک پٹا ہوا مہرہ ہے اور اگر ہم نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا تو ایسے بے ضمیر آدمی کے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی کے بیشتر لمحات لڑائی کے میدانوں میں گزارے ہیں لیکن ابھی تک اس جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا ہے جس پر اس ملک کی آزادی کا دارومدار ہے۔ میرے بعد یہ جنگ تمھیں لڑنی پڑے گی لیکن میسور میں ابھی اجتماعی خصوصیات کا فقدان ہے جو ایک طویل اور صبر آزما جنگ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ تم میسور کو ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار بنانا چاہتے ہو اور یہ امید رکھتے ہو کہ مسلمان عوام تمھاری آواز پر لبیک کہیں گے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تمھیں عوام سے پہلے ان خود غرض اور بد طینت امراء سے سابقہ پڑے گا جو اسلام کے نعرہ کو اپنے اقتدار کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھتے ہیں۔"

ٹیپو نے جواب دیا۔ "ابا جان! اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی بے راہ روی کے باعث مغضوب قوم نہیں بن چکے ہیں اور قدرت انھیں سنبھلنے کا کوئی موقع دینا چاہتی ہے تو وہ ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور ہماری آواز پر وہ غیر مسلم بھی لبیک کہیں گے جو اس ملک کو انگریزوں کی غلامی سے بچانا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ خودکشی کا ارادہ ہی کرچکے ہیں تو ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہوگی۔ ہم اس مقصد کے لیے قربان ہوجائیں

گے جو ہماری ذات سے بہت بلند ہے ہماری فتح انسانیت کی فتح ہوگی اور ہماری شکست ان لوگوں کی شکست ہوگی جنھوں نے ذلت کا راستہ اختیار کیا ہے؟

حیدرعلی نے کہا۔ "بیٹا میں تمھیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ تمھارے راستے میں کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں، اور تمھیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تمھارے یے خدمت پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہو گی۔"

ٹیپو نے کہا۔ "اباجان! میسور کے حکمران کو خدا سلامت رکھے۔ اس وقت میں آپ کی فوج کا ادنیٰ سپاہی ہوں اور یہ اعزاز میرے لیے کافی ہے کہ میں ملیبار کے محاذ پر آپ کی توقعات پوری کرسکوں۔"

حیدرعلی نے کہا۔ "میں اپنی ہر سانس کے ساتھ تمھارے لیے دعا کیا کرتا ہوں۔"

شہزادہ ٹیپو نے کہا: "اباجان! آپ کو طبیبوں کے مشوروں پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔ ان سب کی یہی رائے ہے کہ تندرست ہونے سے پہلے آپ کے لیے سفر ٹھیک نہیں ہوگا۔"

حیدرعلی مسکرایا: "میں نے طبیبوں کے مشوروں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا لیکن اب اگر وہ یہ مشورہ نہ دیتے تو بھی میرے لیے بستر پر لیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"اباجان! آپ بہت جلد تندرست ہو جائیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

حیدرعلی نے مصافحے کے لیئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا جاؤ خدا تمھارے ساتھ ہو!"

تھوڑی دیر بعد بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کی فوج ملیبار کا رخ کر رہی تھی۔ ماہِ نومبر کے تیسرے ہفتے شہزادہ ٹیپو کی افواج ملیبار میں رام گری کے دروازے

پر دستک دے رہی تھیں۔ ہمبراسٹون کی قیادت میں انگریزی فوج ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی رفوچکر ہو چکی تھی۔ ٹیپو نے اس کا پیچھا کیا اور رام گری سے چند میل کے فاصلے پر اسے جالیا۔ ہمبراسٹون نے شیرِ میسور کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگنا زیادہ مناسب سمجھا۔ رات کے وقت ہمبراسٹون کی فوج نے دریا عبور کرنے کے بعد پونانی کا رخ کیا۔ اس عرصہ میں کرنل میکلوڈ کی کمان میں انگریزوں کی ایک اور فوج ہمبراسٹون کی مدد کو پہنچ چکی تھی۔ ٹیپو، پونانی کے گرد گھیرا ڈال کر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے حیدرعلی کی وفات کی خبر ملی۔

اُنیسواں باب

مدراس کا گورنر اپنے دفتر میں جنرل اسٹورٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک نقشہ کھلا ہوا تھا۔ گورنر کا سیکرٹری، نواب محمد علی والا جاہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ گورنر اور جنرل اسٹورٹ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ محمد علی نے جھک کر انھیں سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد گورنر کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی کے چہرے سے امارت اور سیرچشمی کی بجائے بھوک اور حرص اور مردانہ وجاہت کی بجائے لومڑی کی سی عیاری اور سفلہ پن مترشح تھا۔ اس کا بھاری عمامہ اور قیمتی جبّہ اس کی شان وشوکت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس پر ایک غیر ضروری بوجھ معلوم ہوتا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی گورنر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حضورِ والا! ابھی تک جنرل اسٹورٹ یہیں ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم یہ موقع کھو بیٹھیں گے۔ خدا کے لیے دیر نہ کیجیے۔ سرنگا پٹم میں ہمارے دوست آپ کی فوج کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دینا دانشمندی نہیں۔"

گورنر نے ایک حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ محمد علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نواب صاحب! دشمن کو کمزور یا احمق سمجھ لینا بھی دانشمندی نہیں۔"

محمد علی نے جواب دیا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اطلاعات غلط ہیں۔ ٹیپو کے خلاف آپ کے دوستوں

کی سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں اور وہ سلطنت پر قبضہ جما چکا ہے۔"

محمد علی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گورنر، اس کے سیکرٹری اور جنرل اسٹورٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "جناب والا اگر آپ کی فوج حیدر علی کی موت کی اطلاع پاتے ہی سرنگا پٹم کی طرف کوچ کر دیتی تو باغیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے اور ٹیپو کو تخت پر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔"

جنرل اسٹورٹ نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ایسی حماقت نہیں کی ورنہ ہماری تباہی یقینی تھی۔"

"لیکن ٹیپو کو اطمینان سے تیاری کا موقع دینا ایک غلطی ہے۔ اگر آپ سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے تیار نہیں تو کرناٹک کے مقبوضہ علاقوں سے میسور کی فوج کو نکالنے میں آپ کو کون سی مشکل درپیش ہے؟"

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا۔ "سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم فوری حملہ کے لیے تیار نہیں اور میسور کے سپاہی آپ کی خواہشات کا احترام کرنے کی بجائے ہر قدم پر مزاحمت کریں گے۔"

"تو پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ میں حیران ہوں کہ آپ جیسا بہادر اور تجربہ کار جرنیل، ٹیپو سے اتنا مرعوب ہے۔"

جنرل اسٹورٹ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب ہم جانتے ہیں کہ آپ ٹیپو کے متعلق بہت پریشان ہیں لیکن وہ ایک طاقت ور اور ہوشیار دشمن ہے اور ہم پوری تیاری کے بغیر میسور پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اگر وہ آپ کی طرح محض ایک نواب ہوتا تو میں اور میرے سپاہی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر سرنگا پٹم کی طرف یلغار کر دیتے لیکن وہ

ملک سپاہی ہے اور اگر آپ کو اپنی سلطنت کا بیشتر حصہ کھو بیٹھنے کے بعد بھی اس کی قابلیت کے متعلق کوئی شبہ ہے تو ہمیں مشورہ دینے کی بجائے خود سرنگا پٹم کا رخ کیجیے۔"

اسٹورٹ کا خیال تھا کہ محمد علی آپے سے باہر ہو جائے گا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ محمد علی کے چہرے پر ایک فدویانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جنرل اسٹورٹ حیران تھا لیکن انگریز گورنر اور اس کے سیکرٹری کے لیے یہ مسکراہٹ کوئی نئی بات نہ تھی۔ محمد علی کرناٹک کا حکمران بننے کے بعد ہر انگریز کی گالیوں پر مسکرانے کا عادی ہو چکا تھا۔

گورنر نے جنرل اسٹورٹ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "نواب صاحب اس ملک میں ہمارے بہترین دوست ہیں اس لیے ان کی پریشانی بلاوجہ نہیں۔"

گورنر کے ان الفاظ سے محمد علی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کا باپ اسے تھپڑ مارنے کے بعد سیب دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔ "جناب جنرل صاحب بہادر! میرا مطلب یہ تھا کہ میسور پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے اور ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا: "نواب صاحب آپ مطمئن رہیں ہم تیاری کر رہے ہیں اور ایک ماہ تک ہم میسور پر چڑھائی کر سکیں گے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ کو فتح ہوگی۔"

گورنر نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب! ہمیں آپ کے مشوروں سے زیادہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد نواب محمد علی والا جاہ گورنر کے کمرے سے باہر گورنر کے اردلیوں، بیروں، خانساموں اور چپڑاسیوں کو روپے تقسیم کر رہا تھا اور وہ اسے مبارکباد پیش کر رہے تھے۔

* * *

ٹیپو نے عنان حکومت اس وقت سنبھالی جب مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں ایسٹ انڈیا

کمپنی کے حکام اور انگریزوں کی بری و بحری فوج کے جرنیل اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ سرنگا پٹم پہنچنے کا آسان ترین راستہ کون سا ہے۔ سلطان ٹیپو حکومت اور فوج کا نظم و نسق درست کرنے میں مصروف تھا کہ اسے ڈنڈی وش کی طرف جنرل اسٹورٹ کی پیشقدمی کی اطلاع ملی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ پونانی سے جنرل میکلوڈ کی افواج بڈنور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ انگریزوں کی تیسری فوج جنرل میتھیوز کی کمان میں تھی۔ وہ اونور کے آس پاس ملیبار کے چند ساحلی مقامات پر قبضہ کر چکا تھا اور اس کی تجویز یہ تھی کہ بڈنور کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے عقب سے رسد اور کمک کے راستے محفوظ کرنے کے لیے ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے لیکن مدراس اور بمبئی کی حکومتیں بڈنور کی طرف فوری پیشقدمی کرنے کے لیے مصر تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بڈنور کا صوبہ میسور کی سلطنت کا زرخیز ترین علاقہ تھا اور کمپنی کو یہاں بآسانی رسد کا سامان مل سکتا تھا اور اس کے علاوہ یہ علاقہ ساحل سے زیادہ دور نہ تھا اور انگریز اپنی بحری طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو یہ یقین تھا کہ بڈنور کا زرخیز علاقہ خطرے میں دیکھ کر سلطان ٹیپو کمپنی کی شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

سلطان ٹیپو کو بڈنور کی دفاعی قوت پر اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے انگریزوں کی ان افواج کی طرف توجہ دی جو جنرل اسٹورٹ کی کمان میں ڈنڈی وش کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ۱۳ فروری کو سلطان ٹیپو نے جنرل اسٹورٹ کو ڈنڈی وش کے قریب جا لیا۔ فرانسیسی دستے اس کے ساتھ تھے جن کی رہنمائی کاسگنی کر رہا تھا۔ سلطان کے لشکر کی شدید گولہ باری نے جنرل اسٹورٹ کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ جنرل اسٹورٹ کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ونڈی وش اور کرنگلی کے قلعے بارود سے اڑا دیئے تاکہ میسور کی افواج اسلحہ اور رسد کے ذخائر سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ کرناٹک کے میدانوں پر ایک بار پھر دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور جنرل اسٹورٹ کی پسپائی سے مدراس میں کمپنی کے ایوانوں میں زلزلہ

آچکا تھا۔

لیکن اس عرصہ میں بدنور میں ایک غیر متوقع صورت حالات پیدا ہو چکی تھی۔ سات سمندر پار کے تاجروں کی نگاہیں ایک ایسے ملّت فروش کو تلاش کر چکی تھیں جس کی غدّاری ان کی توپوں اور بندوقوں سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ یہ غدار حیدر علی کا لے پالک ایاز خاں تھا۔

○

منگلور کی بندرگاہ پر کشتیوں کے ذریعے ایک چھوٹے سے جہاز پر اسلحہ اور بارود لادا جا رہا تھا۔ صدیق علی خاں بندرگاہ پر ایک فوجی افسر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک خوش پوش آدمی جس کی عمر پچاس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس نے سوال کیا۔ "آپ کا نام صدیق علی خاں ہے؟"

"جی ہاں! فرمایئے۔"

"آپ اس جہاز کے کپتان ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"یہ جہاز کنڈاپور جا رہا ہے؟"

"جی۔"

عمر رسیدہ آدمی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے ابھی اطلاع ملی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وقت پر پہنچ گیا ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "فرمایئے آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

نو وارد نے جواب دیا۔ "ہم آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

معاف کیجیے یہ جہاز ایک فوجی مہم پر جا رہا ہے اور مسافروں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"

نو وارد نے اطمینان سے کہا۔ "میں فوجدار سے مل چکا ہوں۔ وہ خود بھی یہاں

آ رہے ہیں۔ انھوں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان کا انتظار کریں۔"

چار کہار ایک خوبصورت پالکی اور ان کے پیچھے چند آدمی سامان کے صندوق اٹھائے نمودار ہوئے۔ عمر رسیدہ آدمی صدیق علی کو حیران اور پریشان چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کشتیوں کے قریب پالکی اور سامان اتروا دیا۔

ایک سیاہ فام عورت جو اپنے لباس سے خادمہ معلوم ہوتی تھی۔ پالکی کے قریب کھڑی تھی۔ فوجی افسر نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سفر بہت دلچسپ رہے گا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ یہ بڑے میاں اپنے پورے خاندان کے ساتھ میرے جہاز پر سوار ہوں گے؟"

"جی ہاں! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کو اپنے جہاز کا بہترین حصّہ ان کے لیے خالی کرنا پڑے گا۔ وہ دیکھیے فوجدار صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں!"

"لیکن یہ بزرگ ہیں کون؟"

"یہ یہاں کے ایک مشہور تاجر ہیں ان کا نام ناصر الدین ہے۔ پہلے ان کا مرکز کالی کٹ تھا۔ وہاں سے انگریزوں کے حملے کے باعث سخت نقصان اٹھانے کے بعد یہاں آ گئے تھے۔ بدنور کے صوبیدار کے ساتھ ان کے گہرے مراسم ہیں اور پچھلے دنوں میں نے سنا تھا کہ وہاں ان کے بیٹے کو فوج میں کوئی اچھی ملازمت بھی مل گئی ہے۔"

منگلور کا فوجدار سیدھا صدیق علی کی طرف بڑھا۔ فوجی افسر اسے سلام کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا۔

فوجدار نے صدیق علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں آپ کو ایک اور ذمہ داری سونپنے آیا ہوں۔"

"فرمایئے!"

فوجدار نے ناصرالدین کی طرف، جو اب کہاروں اور مزدوروں کو پیسے بانٹنے میں مصروف تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ ان سے مل چکے ہیں؟"

"جی ہاں! لیکن میں حیران ہوں کہ ان کے خاندان کے لیے میرے جہاز میں کہاں جگہ ہوگی۔"

فوجدار نے کہا "یہ ایک مجبوری ہے۔ یہ بڈنور کے گورنر کے دوست ہیں اور وہاں اپنے لڑکے کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ گورنر نے پچھلے ہفتے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں انھیں جہاز پر کنڈاپور پہنچانے کا انتظام کر دوں لیکن یہ سواریوں کے جہاز کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے انھیں کہا ہے کہ فوجی جہاز پر آپ کو تکلیف ہوگی لیکن وہ بضد ہیں اور اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ بضد کیوں ہوں تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ فوجی جہاز پر عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"مجھے ان کی ضد سے کوئی بحث نہیں۔ بہرحال مجھے آپ کا حکم ماننا پڑے گا۔"

فوجدار نے کہا۔ "اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کی صاحبزادی، بڈنور کے گورنر کی بیوی بننے کے لیے وہاں جا رہی ہیں تو میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

ایک گھنٹہ بعد جہاز کے بادبان کھولے جا چکے تھے۔ ناصرالدین کے ساتھ اس کی بیٹی کے علاوہ ایک خادمہ اور دو نوکر تھے۔ صدیق علی نے انھیں اپنے کمرے میں جگہ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس جہاز پر اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی۔ آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ ان دنوں بحری سفر خطرے سے خالی نہیں۔ انگریزوں کے جنگی جہاز ہمارے ساحل کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔"

ناصرالدین نے بے اعتنائی سے جواب دیا "یہ ایک مجبوری ہے ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

○

اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے ناصرالدین کی لڑکی نے اسے گہری نیند سے جگایا

"ابّاجان! ابّاجان!"

ناصرالدین نے آنکھیں ملتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا "بیٹی تمھیں معلوم ہے کہ گذشتہ رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی اور اب بھی میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سویا۔"

لڑکی نے کہا "اباجان آپ پورے پانچ گھنٹے سوئے ہیں۔ دیکھیے اب شام ہو رہی ہے۔ ابّاجان ملاح شور مچا رہے ہیں۔ خادمہ کہتی ہے کہ جہاز کا کپتان آنکھوں سے دوربین لگائے کھڑا تھا۔"

ناصرالدین نے برہم ہو کر کہا "یہ کون سی نئی بات ہے۔ جہاز کے کپتان ہمیشہ دوربین لگا کر دیکھا کرتے ہیں۔"

"لیکن خادمہ کہتی ہے، اس نے دور کوئی جہاز دیکھ کر ملاحوں کو خبردار رہنے کا حکم دیا ہے!"

"خادمہ کہاں ہے؟"

"میں نے اسے دوبارہ پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ خدا کے لیے آپ بھی جا کر پتہ کر آئیں۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "بیٹی اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو کپتان ہمیں خود آ کر بتاتا۔"

صدیق علی دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے!"

"خیر تو ہے؟" ناصرالدین نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے پوچھا

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

ناصرالدین کمرے سے باہر نکلا اور صدیق علی نے اسے چند قدم دور لے

جاکر کہا۔ "میں آپ کی صاحبزادی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دوپہر کے وقت ایک جہاز دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ کافی دور تھا اور میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ انگریزی ہے یا فرانسیسی۔ اب اِس پر انگریزوں کا جھنڈا صاف دکھائی دے رہا ہے۔ رات آرہی ہے۔ ہمیں چند گھنٹوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس بات کا بہت امکان ہے کہ صبح ہوتے ہی ہم دشمن کی توپوں کی زد میں ہوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کشتی میں ساحل پر پہنچا دیا جائے۔"

نوجوان لڑکی اپنے چہرے پر نقاب ڈالے کمرے سے باہر نکلی اور اس نے کہا۔ "ابا جان! کیا بات ہے؟"

ناصرالدین نے جواب دیا۔ "بیٹی پریشانی کی کوئی بات نہیں، جاؤ بیٹھو!"

لڑکی نے کہا۔ "اگر کوئی خطرہ ہے تو میں جاننا چاہتی ہوں۔"

ناصرالدین نے پریشان ہوکر صدیق علی کی طرف دیکھا اور اس نے کہا: "دیکھیے مجھے ڈر ہے کہ صبح تک ہمارے جہاز پر انگریزی جہاز حملہ نہ کر دے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو راتوں رات ساحل پر پہنچا دیا جائے۔ ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں اور اس علاقے میں جگہ جگہ ہماری چوکیاں ہیں اور کسی چوکی سے بھی آپ کے لیے گھوڑوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ راستے میں رکنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم گھوڑوں پر سفر کرنے کی بجائے آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

صدیق علی نے جواب دیا: "میں چند منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتا۔ میرا کام گنڈا پورا اسلحہ پہنچانا ہے۔ میں اس کشتی کا انتظار بھی نہیں کروں گا۔ جو آپ کو ساحل تک پہنچانے جائے گی۔ میرے جو ملاح آپ کے ساتھ جائیں گے وہ ساحل کی کسی چوکی سے

خشکی کے راستے آپ کے باقی سفر کا انتظام کر دیں گے۔"

لڑکی نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "لیکن ہم کشتی پر نہیں جائیں گے۔ میں کشتی پر سوار ہونے کی بجائے جہاز پر رہنا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "شاید میں نے آپ کے سامنے صورتِ حالات کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا۔ میں نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ انگریزی جہاز جو میں نے دیکھا ہے، تنہا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ صبح تک ایک دو اور جہاز ہمارے مقابلے پر آجائیں۔ اس صورت میں آپ کی حفاظت کا مسئلہ میرے لیے انتہائی پریشان کن بن جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جائیں لیکن میں خطرات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔"

لڑکی نے کہا: "اس جہاز پر سوار ہوتے وقت ہمیں کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ جب چاہیں ہمیں راستے میں اتار سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمیں آگے نہیں لے جانا چاہتے تو ہمیں واپس منگلور پہنچا دیجیے!"

صدیق علی نے کہا: "معاف کیجیے میں آپ کے ساتھ بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس جہاز میں کسی مسافر کو جگہ دینا میری غلطی تھی۔"

ناصرالدین نے صدیق علی کا لب و لہجہ دیکھ کر فوری مداخلت کی ضرورت محسوس کی اور کہا۔ "رضیہ، کپتان صاحب ہمارے فائدے کی بات کہہ رہے ہیں۔ یہ منگلور سے ہی ہمیں اس جہاز پر جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔"

رضیہ بولی: "لیکن کپتان صاحب کو یہ حق نہیں کہ وہ ہمیں منگلور سے لاکر کسی ویران جگہ پر اتار دیں۔"

ناصرالدین نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہوکر کہا: "کپتان صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر بدنور پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس بدنور کے صوبیدار

کے دو پیغامات آچکے ہیں اور انھوں نے منگلور کے قلعہ دار کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ ہمارے سفر کا فوری انتظام کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کنڈا پور کی بندرگاہ پر میرا لڑکا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملّاح تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔" جناب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی جہاز ہم سے کترا کر جنوب کا رخ کر رہا ہے۔"

صدیق علی کچھ کہے بغیر جہاز کے عرشہ کی طرف بڑھا اور دُوربین آنکھوں سے لگا کر انگریزی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو ناصرالدین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

صدیق علی نے کہا" معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ آپ اپنی صاحبزادی کو تسلّی دیں۔"

رات کے وقت ناصرالدین رضیہ سے یہ کہہ رہا تھا" بیٹی! تمھیں کپتان کے ساتھ اس قدر زیادتی سے پیش نہیں آنا چاہیئے تھا۔ وہ سرنگا پٹم کے ایک نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس کے والد کو جانتا ہوں وہ میسور کی فوج کا ایک قابلِ قدر افسر ہے۔

رضیہ نے کہا۔" ابّا جان میں اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس آیا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ پھر جب اس نے آپ کے ساتھ علٰحدگی میں بات کرنے کی کوشش کی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ شاید میرے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ میں کوئی خطرناک خبر سنتے ہی چیخیں مارنا شروع کر دوں گی، اگر وہ اپنے اختیارات کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ہمیں نرمی سے سمجھاتا تو شاید میں کشتی پر سوار ہونے کے لیے تیار بھی ہو جاتی۔ اس کا طرزِ گفتگو میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔"

ناصرالدین نے کہا۔" مجھے معلوم ہے کہ تمھارا مقصد صرف اسے چڑانا تھا ورنہ تمھارا چہرہ یہ بتا رہا تھا کہ جب کشتی اتاری جائے گی تو تم مجھ سے پہلے اس میں سوار ہونے کی کوشش کرو گی اور میں یہ بھی کہوں گا کہ اس کی گفتگو نہایت شائستہ تھی۔ بہرحال میں نے تمھاری طرف سے معذرت کر دی ہے۔"

"آپ نے یہی کہا ہوگا کہ میں بہت ضدّی ہوں؟"

"نہیں! میں نے یہ کہا تھا کہ تم کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہو۔"

* * *

اس کے بعد راستے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ایک دن علی الصباح صدیق علی کا جہاز کنڈا پور کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ قلعے کے سپاہی اور جہاز کے ملّاح کشتیوں پر سامان اتارنے میں مصروف تھے۔

رضیہ نے اپنے باپ کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" ابا جان اٹھیے! شاید بندرگاہ آگئی ہے۔"

" دیکھو بیٹی! مجھے تنگ نہ کرو۔" باپ نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔

رضیہ نے دوبارہ اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" ابا جان دیکھیے! شاید کنڈا پور آگیا ہے۔"

باپ نے ملتجی ہو کر کہا" خدا کے لیے مجھے سونے دو کنڈا پور ابھی بہت دور ہے۔"

رضیہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صدیق علی عرشے پر کھڑا سامان اتارنے والے سپاہیوں اور ملّاحوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ رضیہ کچھ دیر اس سے چند قدم دور کھڑی بندرگاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں کے سوا اس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صدیق علی نے ایک بار اس کی طرف

دیکھا اور بے توجہی سے منہ پھیر لیا۔ جہاز پر پہلی گفتگو کے بعد وہ حتی الوسع اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ رضیہ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی۔ بالآخر جرأت کر کے آگے بڑھی اور صدیق علی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی "یہ کنڈاپور ہے؟"

"جی ہاں! ہم رات کے تیسرے پہر یہاں پہنچ گئے تھے۔"

"کوئی ہمارے متعلق پوچھنے نہیں آیا؟ مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی ضرور آیا ہو گا۔"

ممکن ہے آپ کا بھائی بندرگاہ پر کہیں ٹھہرا ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو اس جہاز پر آپ کی آمد کی توقع نہیں ہو سکتی۔"

رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے، ورنہ آپ تو ہمیں راستے میں ہی دھکا دینے پر آمادہ تھے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "بعض فرائض بہت ناخوشگوار ہوتے ہیں اور یہ ان میں سے ایک تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آپ تکلیف سے بچ گئیں۔ اب آپ تیاری کریں آپ کے لیے کشتی تیار ہے۔ میں نے قلعہ دار کو آپ کی آمد کی اطلاع بھیجدی ہے۔ شاید وہ آپ کے استقبال کے لیے پہنچ جائے۔"

رضیہ نے کہا۔ "اس دن شاید آپ کو میری باتیں ناگوار محسوس ہوتی تھیں۔ میرا یہ ارادہ تھا کہ کنڈاپور پہنچ کر آپ سے معذرت کروں گی۔"

صدیق علی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "باتوں میں شاید میں نے بھی آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ آپ شام کے وقت کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہیں۔"

"جی یہ بالکل غلط ہے۔" رضیہ یہ کہہ کر صدیق علی سے زیادہ اپنے باپ کو کوستی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناصرالدین کو بازو سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ کہہ رہی تھی۔

"ابا جان! آپ نے اس نیم پاگل آدمی سے یہ کیوں کہا تھا کہ میں کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہوں؟"

ناصرالدین نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آج تم مجھے بالکل نہیں سونے دوگی۔"

تھوڑی دیر بعد ناصرالدین، رضیہ اور ان کی خادمہ اور نوکر ایک کشتی پر سوار ہو کر بندرگاہ کا رخ کر رہے تھے اور صدیق علی خاں ان کے پیچھے دوسری کشتی میں سوار تھا، دونوں کشتیاں ایک ساتھ ساحل پر لگیں۔ کنڈاپور کا قلعہ دار چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر پہلے ناصرالدین اور پھر رضیہ کو سہارا دے کر کشتی سے اتارا۔ قلعہ دار، صدیق علی سے مصافحہ کرنے کے بعد ناصرالدین کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کہا۔ "ہم نے آپ کے سفر کا انتظام کر دیا ہے۔ چلیے پہلے قلعہ میں ناشتا کر لیجیے۔"

ناصرالدین نے صدیق علی کو اس نوجوان کی طرف جو چند قدم پیچھے رضیہ کے پاس کھڑا تھا متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "کپتان صاحب یہ میرا بیٹا افتخارالدین ہے۔"

افتخارالدین نے آگے بڑھ کر گرمجوشی کے ساتھ صدیق علی نے مصافحہ کیا۔

قلعہ دار نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ "ان کا سامان قلعے میں لے چلو۔"

افتخارالدین نے قلعہ دار سے کہا۔ "لیکن ہم کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

ناصرالدین نے احتجاج کیا۔ "نہیں نہیں! کھانا کھانے کے بعد میں آرام کروں گا۔ اب ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

سپاہیوں نے سامان اٹھا لیا اور ناصرالدین اور اس کے ساتھی ان کے پیچھے قلعے کی طرف چل دیے۔

قلعہ دار نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ انھیں لے آئے۔ صوبیدار صاحب مجھ سے بہت برہم تھے۔ چند دن قبل انھوں نے یہ حکم بھیجا تھا کہ انھیں لانے کے لیے ایک خاص جہاز بھیج دیا جائے۔ بدقسمتی سے یہاں کوئی جہاز موجود نہ تھا۔ پھر ان کا دوسرا حکم آیا کہ منگلور کے فوجدار کو ان کے سفر کا انتظام کرنے کا حکم بھیجا جا چکا ہے، اس لیے یہاں سے خاص جہاز بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا صاحبزادہ ایک ہفتے سے ان کا یہاں انتظار کر رہا تھا لیکن کل صبح ان کا تیسرا حکم آیا کہ اب سمندر کا راستہ خطرناک ہے، اگر وہ پہنچ نہیں گئے تو تم خشکی کے راستے چند سپاہی بھیج کر منگلور کے فوجدار کو یہ ہدایت کر دو کہ انھیں سمندر کے بجائے خشکی کے راستے بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور میں نے یہ حکم ملتے ہی چند سوار منگلور کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "گورنر صاحب ایک باخبر آدمی ہیں۔ بحری سفر کے متعلق ان کے خدشات بلاوجہ نہیں تھے۔ میں نے راستے میں ایک انگریزی جہاز دیکھا تھا آپ کو چوکس رہنا چاہیئے۔"

ایک نوجوان ہجوم سے نکل کر "بھائی جان۔ بھائی جان!" کہتا ہوا صدیق علی کی طرف بڑھا اور صدیق علی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "مسعود! تم کب یہاں آئے؟"

"بھائی جان! میں تین دن سے یہاں ہوں۔ ہمیں اس قلعے کے آس پاس کی دفاعی چوکیوں کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے دستے یہاں سے دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو میرے ساتھ چلیے۔ چچا اسد خاں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"وہ یہاں ہیں؟"

"ہاں بھائی جان! اور جب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ وہ ہمارے کمانڈر ہیں

تو آپ اور زیادہ حیران ہوں گے، چلیے میں آپ کو ان سے ملاتا ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "ابھی جہاز پر دو توپیں رہ گئی ہیں۔ میں انھیں اتروانے کے بعد تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب توپیں جہاز سے اتار کر ساحل پر پہنچا دی گئیں تو صدیق علی نے قلعہ دار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اب جہاز پر غلّہ لدوانا آپ کی ذمہ داری ہے میں کل صبح ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

قلعہ دار نے کہا۔ "غلّے کے لیے چند دن آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "لیکن منگلور کے فوجدار نے مجھے فوراً واپس پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ آپ کو ان کی ہدایات موصول نہیں ہوئیں؟"

"ان کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں لیکن مجھے بدنور کے صوبہ دار کا حکم ہے کہ ان کی اجازت حاصل کیے بغیر یہاں سے کوئی چیز نہ بھیجی جائے۔ میں نے منگلور کے فوجدار کا مراسلہ ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ چلیے آپ قلعے میں قیام کریں۔ مجھے امید ہے کہ آج یا کل تک ان کی طرف سے جواب آ جائے گا۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "نہیں میری جگہ جہاز میں ہے۔ میں اب اسد خاں سے ملنے جا رہا ہوں۔ چلو مسعود!"

مسعود علی نے کہا۔ "بھائی جان! میں پیدل آیا ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو قلعے سے گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"نہیں! میں پیدل چلنا چاہتا ہوں۔"

صدیق علی اور مسعود سمندر کے کنارے کنارے چند دفاعی چوکیوں کے قریب سے گزرنے کے بعد دائیں ہاتھ مڑے اور کوئی دو میل چلنے کے بعد محفوظ فوج کے پڑاؤ میں

داخل ہوئے۔

اسد خاں اپنے خیمے سے باہر چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ اچانک صدیق علی کی طرف متوجہ ہوا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ارے تم کہاں ؟"

"جی میں منگلور سے اسلحہ لے کر آج ہی پہنچا ہوں۔ ابھی مسعود نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں اور میں حیران ہوں کہ۔۔۔!!"

اسد خاں بولا "کہو کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو گئے ؟"

"کچھ نہیں چچا جان !"

اسد خان مسکرایا۔ "برخوردار! تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس عمر میں ایک سپاہی کا لباس مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "نہیں چچا جان، میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ میسور کو جنگ کے میدان سے باہر آپ کی خدمات کی زیادہ ضرورت ہے۔"

اسد خان نے کہا۔ "مجھے ہنگامی حالات میں صرف خانہ پری کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "چچا جان! یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے میں جانتا ہوں کہ چند سال قبل میسور کی فوج کے بہترین افسر آپ کی فوجی صلاحیتوں کے معترف تھے۔"

اسد خان بولا "بیٹا! یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری رگوں میں خون تھا۔ اب خدا سے دعا کرو کہ میں اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کر سکوں۔"

"چچا جان! آپ ہر ذمہ داری کے اہل ہیں اور مجھے صرف آپ کی ذات کے لیے دعا کرنی چاہیئے۔"

اسد خاں نے کہا۔ "فوج میں رہ کر میری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔ تم کب تک یہاں ہو؟"

"میں کل علی الصباح یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا لیکن اب شاید ایک دو دن ٹھہرنا پڑے۔"

* * *

صدیق علی نے باقی دن اسد خان اور اپنے بھائی کے ساتھ پڑاؤ میں گزارا غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اس نے اسد خان سے اپنے جہاز پر واپس جانے کی اجازت لی تو مسعود اسے ساحل تک پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ ہو گیا۔

قلعے کے قریب سے گزرتے ہوئے انھیں افتخار الدین بندرگاہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ "میں جہاز پر آپ کو تلاش کرنے گیا تھا۔"

"کیوں خیر تو ہے، میرا خیال تھا آپ یہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔"

"میں تو اسی وقت روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن ابا جان آج سفر کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اب ہم انشاءاللہ کل علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔ ابا جان کی خواہش ہے کہ آپ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

"بہت اچھا! لیکن میں زیادہ دیر آپ کے پاس نہیں ٹھہر سکوں گا۔ رات کے وقت میرا جہاز پر ہونا ضروری ہے۔"

افتخار الدین نے کہا۔ "ہم آپ کو بہت جلد فارغ کر دیں گے۔ چلیے ابا جان کہتے تھے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آؤں۔"

صدیق علی نے مسعود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا بھائی مسعود علی ہے۔"

افتخار الدین نے مسعود علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام افتخار الدین ہے۔ میں نے آپ کو یہاں دو تین بار بندرگاہ پر دیکھا ہے، آیئے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ ابا جان! آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

مسعود علی نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے واپس اپنے پڑاؤ میں جانا ہے۔"

افتخار الدین نے کہا۔ "میں آپ کو اپنے نوکر کے ساتھ گھوڑا دے کر بھیج دوں گا۔"

افتخار الدین کے اصرار پر مسعود اس کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار نہ کر سکا۔

تھوڑی دیر بعد یہ تینوں قلعے کے ایک کمرے میں ناصرالدین کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رضیہ برابر کے کمرے میں نیم وا دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ افتخارالدین اور مسعود علی پہلی ملاقات میں ہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔

ناصرالدین کا ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "قلعہ دار صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔"

ناصرالدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "انھیں اندر لے آؤ۔"

نوکر باہر نکل گیا اور چند ثانیے بعد قلعہ دار کمرے میں داخل ہوا۔ صدیق علی، مسعود علی اور افتخار الدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

قلعہ دار نے کہا۔ "بڈنور سے صوبیدار صاحب کا ایلچی ابھی پہنچا ہے۔ انھوں نے تاکید کی ہے کہ اگر آپ پہنچ گئے ہوں تو آپ کو فوراً یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "تشریف رکھیے! ہم انشاءاللہ علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ کھانا کھانے کے بعد فوراً روانہ ہو جاتے تو اچھا تھا۔"

ناصرالدین نے جواب دیا۔ "صوبیدار صاحب کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

قلعہ دار نے کہا۔ "جناب! صوبیدار صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ساحلی علاقے ہر وقت خطرے میں ہیں اور یہاں آپ کا قیام ٹھیک نہیں۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "یہ قلعہ جہاز کی نسبت بہرحال زیادہ محفوظ ہے اور صوبیدار صاحب کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"لیکن انھیں آپ کی آمد کی توقع تو تھی نا؟"

"بہرحال رات کے وقت سفر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر آپ کو اس قلعے میں ہمارا ٹھہرنا پسند نہیں تو ہم پڑاؤ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔"

"جناب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں سارا قلعہ آپ کے لیے خالی کرا دوں۔"

صدیق علی نے سوال کیا۔ "صوبیدار صاحب کا ایلچی غلّے کے متعلق بھی کوئی پیغام لایا ہے؟"

"نہیں غلّے کے متعلق انھوں نے کچھ نہیں لکھا لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بہت ممکن ہے کل ان کا حکم آجائے۔ اگر کل نہیں تو پرسوں ضرور آجائے گا۔"

کچھ دیر بعد یہ لوگ قلعے کے ایک اور وسیع کمرے میں چند افسروں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ دسترخوان پر ناصرالدین کی گفتگو انتہائی شگفتہ تھی لیکن قلعہ دار کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ناصرالدین نے کوئی لطیفہ سنانے کے بعد قلعہ دار سے سوال کیا۔

"آپ بہت مغموم نظر آتے ہیں خیر تو ہے؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ناصرالدین اور اس کا لڑکا، صدیق علی اور اس کے بھائی کو رخصت کرنے کے لیے قلعے کے دروازے تک آئے۔ مسعود علی کے لیے افتخار الدین کا ایک نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا۔

ناصرالدین نے صدیق علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم علی الصباح روانہ

ہیں؟" جواب میں اسے بدحواس سپاہیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ "کماندار ابھی یہاں تھے۔" "کماندار صاحب گھوڑے پر آگے نکل گئے ہیں۔"

صدیق علی نے پانچویں چوکی کے قریب پہنچ کر اپنا سوال دہرایا، تو تاریکی میں اسے مسعود علی کی آواز سنائی دی۔ "بھائی جان! بھائی جان! کماندار صاحب اگلے مورچے میں ہیں وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے تھے۔"

"مسعود! مسعود!!" صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان کے پاس لے چلو!"

وہ بھاگتے ہوئے اگلے مورچے میں داخل ہوئے۔ اسدخان زمین پر لیٹا ہوا تھا اور چند افسر اور سپاہی اس کے گرد جمع تھے۔

"چچا جان!" صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھ کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

اسدخان نے نحیف آواز میں کہا۔ "کون —! صدیق علی — تم یہاں!! لیکن تمھارا جہاز؟"

"میرا جہاز ڈوب چکا ہے۔ آپ کے زخم زیادہ شدید تو نہیں؟"

"میرے زخموں کی پروا نہ کرو۔ میری منزل آ چکی ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "چچا جان! ان حالات میں فوج کو آگے لانے کی بجائے پیچھے ہٹانے کی ضرورت تھی۔"

اسدخان نے جواب دیا۔ "ان چوکیوں کی حفاظت میرا فرض تھا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "ان چوکیوں کے سپاہی دور مار توپوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے اور وہ آپ کے پاس نہیں ہیں۔"

اسدخاں نے کہا۔ "ہمارے پاس چار بڑی توپیں تھیں اور وہ میں نے قلعہ دار کے اصرار پر یہاں پہنچتے ہی قلعہ کے اندر بھجوا دی تھیں۔ تم لوگوں کو میرے گرد جمع ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تمھارا کام یہ ہے کہ دشمن کو رات کے وقت ساحل پر اترنے کا موقع نہ دو۔"

صدیق علی نے کہا۔ "چچا جان! دشمن اس جگہ فوجیں نہیں اتارے گا۔ وہ جانتا ہے کہ قلعے کے آس پاس کا علاقہ اس کیلئے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔"

اسدخان نے کہا۔ "تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "جب دشمن کے جہاز ہمارے جہاز پر گولہ باری کر رہے تھے تو قلعے کی توپیں خاموش تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ قلعے کے محافظ برجوں سے مشعلیں دکھا کر یہ بتا رہے تھے کہ ہم یہاں ہیں۔ اس لیے تمھاری توپوں کا رخ دوسری طرف ہونا چاہیئے۔"

اسدخان نے اچانک اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن درد سے کراہتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ "صدیق علی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تمھارا مشورہ کیا ہے؟"

صدیق علی نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ان مورچوں پر دشمن کی گولہ باری محض ایک دکھاوا ہے۔ وہ صبح کے وقت اطمینان سے قلعے کے آس پاس فوجیں اتار دے گا۔ اگر آپ کنڈاپور کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں صبح سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ آپ پڑاؤ میں سوار دستوں کو یہ حکم بھیج دیجیے کہ اس طرف ابھی ان کی ضرورت نہیں۔ وہ دشمن کے جنگی بیڑے کی توپوں کی زد سے دور رہیں۔ پھر اگر دشمن نے کسی جگہ فوج اتار دی تو انھیں کام میں لایا جا سکے گا۔"

اسدخان نے کہا۔ "صدیق میرا وقت آ چکا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت نے تمھیں بلاوجہ نہیں بھیجا۔ جب تک یہاں میری جگہ لینے کے لیے کوئی اور نہیں آ جاتا میں اس فوج کی کمان تمھیں سونپتا ہوں۔"

"چچا جان! مجھے یقین ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر صدیق علی سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "انھیں پڑاؤ کے پیچھے کسی محفوظ جگہ لے جاؤ۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔"

اسد خان نے نحیف آواز میں کہا۔ "بیٹا تم وقت ضائع نہ کرو۔ اب میرے لیے کوئی جگہ غیر محفوظ نہیں۔"

سپاہی اسد خاں کو تختے پر ڈال کر اٹھانے لگے تو کسی نے کہا۔ "جلدی سے پانی لاؤ، یہ بے ہوش ہیں۔"

فوجی طبیب نے جلدی سے نبض ٹٹولی اور پھر جھک کر تھوڑی دیر اس کے سینے سے کان لگانے کے بعد کہا۔ "اب انھیں پانی پلانے کی ضرورت نہیں۔"

○

صدیق علی نے ڈیڑھ سو سپاہیوں کو ساحلی چوکیوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر محفوظ فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کو قلعے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ صبح کی روشنی کے ساتھ دشمن کے جنگی بیڑے کی گولہ باری بند ہو چکی تھی۔ صدیق علی کی رہنمائی میں یہ فوج قلعے کے قریب پہنچی تو برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔ صدیق علی نے دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھولو!"

کچھ دیر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر بڑے پھاٹک کی بجائے بغلی دروازہ کھلا اور صدیق علی کی توقع کے خلاف قلعہ دار نے باہر نکل کر کہا۔ "تمھارے کمانڈر کہاں ہیں؟"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ صلح کا جھنڈا کس کے حکم سے بلند کیا ہے؟"

قلعہ دار نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھنے کا حق نہیں رکھتے تاہم آپ کی تسلی کے لیے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ میں نے اپنے سے بڑے دل کی ہدایات پر عمل کیا ہے۔"

"اور حملے کے وقت آپ نے قلعے کے برجوں پر جو روشنی کی تھی وہ بھی غالباً کسی بڑے کی ہدایت کے مطابق تھی؟"

"ہاں!"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بڑا کون ہے؟"

"اس وقت اس سوال کا جواب میں صرف فوج کے کمانڈر کو دے سکتا ہوں۔ تمھارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اس وقت میں اس فوج کا کمانڈر ہوں۔"

"اگر آپ اس فوج کے کمانڈر ہیں تو آپ کے لیے بدنور کے گورنر کا یہ حکم ہے کہ آپ فوج کو یہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائیں۔ وہاں آپ کو مزید ہدایات مل جائیں گی۔"

"میں بدنور کے گورنر سے تصدیق کیے بغیر کوئی نیا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس فوج کو کنڈا پور کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور کنڈا پور کی حفاظت ہم اس وقت تک کریں گے جب تک کہ دشمن اس قلعے کی دیواریں زمین سے ہموار نہیں کر دیتا۔"

قلعہ دار کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے کہا۔ "اس قلعے کے ساتھ تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی حفاظت کے متعلق سوچنا ہمارا کام ہے۔"

"اور تم نے اس کی حفاظت کا جو نیا طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب رات ہو تو قلعے کے برجوں پر روشنی کر دی جائے اور جب صبح ہو جائے تو سفید جھنڈا لہرا دیا جائے۔"

"میں نے جو کچھ کیا ہے میں اس کی پوری ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

ہمیں حکم تھا کہ خطرے کے وقت یہ قلعہ خالی کر دیا جائے۔"

"اور تمھیں یہ بھی حکم تھا کہ خطرے کے وقت دشمن کو یہ بتا دیا جائے کہ تمھارا مقابلہ کرنے والی فوج باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

"میرا فرض اپنے سپاہیوں کو بلاوجہ ہلاک ہونے سے بچانا تھا لیکن تم جیسے گستاخ آدمی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمھارے نزدیک ان سپاہیوں کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی تو تمھیں اس بات کی آزادی ہے کہ تم سینہ تان کر دشمن کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ لیکن مجھے حیدر گڑھ پہنچنے کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔"

یہ کہہ کر قلعہ دار دروازے کی طرف پلٹا لیکن صدیق علی نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور میان سے تلوار نکال کر اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم قلعے کے اندر نہیں جا سکتے۔"

ایک ثانیہ کے اندر اندر پہرے داروں نے قلعے کا بغلی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

قلعہ دار نے کہا۔ "تمھیں شاید معلوم نہیں کہ تمھارے سپاہی اس وقت ہماری گولیوں کی زد میں ہیں۔ اگر تم فصیل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف کرو تو تمھاری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔"

صدیق علی نے کہا۔ "تم یہ دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہو گے کہ ہماری غلط فہمیاں کس حد تک دور ہوئی ہیں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر قلعے کا دروازہ نہ کھلا تو میری تلوار تمھارے سینے سے پار ہو گی۔"

قلعہ دار نے صدیق علی کے الفاظ سے زیادہ اس کی تلوار کی نوک کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس کیا اور اس نے کسی توقف کے بغیر بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھول دو!"

دروازہ کھل گیا اور صدیق علی اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ قلعے کے سپاہی پریشانی اور تذبذب کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے صدیق علی نے بلند آواز میں کہا۔ "جس ملک کی فوج میں غدار موجود ہوں اس کے آہنی قلعے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ میرے دوستو! اس قلعے کا محافظ دشمن کے ساتھ مل گیا ہے۔ میسور کی فوج تمھاری اور تمھاری آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ میسور کی فتح اس ملک کے ہر اس باعزت انسان کی فتح ہو گی جو ایک باعزت قوم کے فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور اگر خدانخواستہ میسور کو شکست ہوئی تو اس کے نتائج صرف میسور کی سرحدوں تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ہندوستان کا ہر حریت پسند یہ محسوس کرے گا کہ اس کے لیے عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ تمھارے قلعہ دار کو دشمن کے حملے کا قبل از وقت علم تھا اور اس نے دشمن کے استقبال کے لیے قلعے پر چراغاں کیا تھا۔ اس کی بزدلی اور غداری کے باعث ہمارے کئی آدمی شہید ہو چکے ہیں۔ کاش میں ہر غدار کو قلعے کے دروازے پر چالیس بار پھانسی دے سکتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میں سے اور کون ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔"

قلعے کے سپاہیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم دشمن کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دینا چاہتے ہو یا بزدلوں اور غداروں کی موت مرنا چاہتے ہو؟"

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

چند اور آدمیوں نے اس کی تقلید کی اور وہ ایک ایک کر کے صدیق علی کے گرد جمع ہونے لگے۔

صدیق علی نے کہا: "اس قلعے میں اسلحہ کی کمی نہیں، بارود کا ذخیرہ جو میں لایا تھا، اتنا ہے کہ ہم کم از کم ایک ہفتہ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس عرصہ میں یقیناً ہمیں کمک پہنچ جائے گی۔"

ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہم آپ کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارے پاس جو بارود ہے وہ ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں۔ آپ جو بارود اپنے جہاز پر لائے تھے وہ رات کے حملے سے پہلے ہی سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ قلعہ دار دشمن کے ساتھ سازباد کرنے کے بعد ہماری طرف سے مطمئن نہ تھا، اسے یہ خدشہ تھا کہ ہم کہیں اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ شخص کنڈاپور کی قسمت کا فیصلہ دشمن کی آمد سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ اسے لے جاؤ اور قلعہ سے باہر کسی درخت کے ساتھ لٹکا دو!"

صدیق علی کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اپنی سنگینیں قلعہ دار کی طرف سیدھی کر دیں اور اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔

قلعہ دار چلایا۔ "بدنور کا گورنر میرے بدلے تم میں سے ہر ایک کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔ میں نے اس کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ میرا معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے۔ خدا کے لیے کسی آدمی کو بھیج کر میرے متعلق ان سے پوچھ لو۔ ورنہ مجھے بدنور بھیج دو۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر تم بدنور کے صوبیدار کے بھائی ہوتے تو بھی اس غداری کے بعد میں تمھارے متعلق کسی تحقیقات کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ اگر تم سلطانِ معظم کے بھائی ہوتے تو بھی تمھارے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔"

ناصر الدین، افتخار الدین اور رضیہ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ افتخار الدین سپاہیوں کو راستے سے ہٹاتا

ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا "بھائیو! یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، اس نے اس شخص کے خلاف غلط بیانی کی ہے جسے حیدر علی اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس کے لیے کوئی سزا کافی نہیں ہو سکتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس کی سازش میں جو افسر یا سپاہی شریک ہیں۔ ان سب کو پھانسی دے دی جائے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "افتخار! میں اس معاملے کی پوری چھان بین کروں گا لیکن اس وقت ہمارے سامنے فوری مسئلہ اس قلعے کی حفاظت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں تم دوبارہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے والد اور ہمشیرہ کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔"

افتخار الدین نے جواب دیا۔ "میں ایک سپاہی ہوں اور میرے ابا اور ہمشیرہ بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میرے ساتھ جو دس آدمی آئے تھے وہ انھیں بدنور پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر ناصر الدین سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں۔ آپ بدنور پہنچ کر گورنر کو میرا یہ پیغام دیجیے کہ کنڈاپور کی فوج آخری دم تک دشمن کا مقابلہ کرے گی۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "میں وہاں پہنچتے ہی آپ کو کمک بھجوانے کی کوشش کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد قلعے کے دروازے سے باہر افتخار الدین اپنے باپ اور اپنی بہن کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سامنے ایک درخت پر قلعہ دار کی لاش لٹک رہی تھی۔

رضیہ نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے "بھائی جان! اپنا خیال رکھنا!"

فصیل سے ایک سپاہی نے بلند آواز میں کہا: "سامنے دو جہاز کشتیوں پر فوج اتار رہے ہیں اور شمال مغرب سے چار اور جہاز اس طرف آرہے ہیں۔"

صدیق علی نے کہا: "سپاہیو! اپنے مورچے سنبھال لو۔ سفید جھنڈا اتار دو اور قلعے کا دروازہ بند کرلو۔"

افتخارالدین نے کہا: "انگریز لڑائی سے زیادہ چال اور دغابازی پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہمیں سفید جھنڈا اس وقت اتارنا چاہیئے جب ان کی کشتیاں ہماری توپوں کی زد میں آجائیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا: "جنگ اور صلح کے متعلق ہمارے اصول ان سے مختلف ہیں۔ میں سلطان ٹیپو کا سپاہی ہوں اور سلطان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ہم دھوکے اور فریب میں دشمن کی پیروی کریں۔ میں قلعہ دار کو اس کے جرم کی سزا دے چکا ہوں۔ دشمن سے اس کی غداری کا انتقام نہیں لے سکتا۔"

صدیق علی فصیل پر چڑھا۔ دشمن کے جہازوں سے چھ کشتیاں کنارے کی طرف آرہی تھیں۔ ایک کشتی پر سفید جھنڈ لہرا رہا تھا۔ صدیق علی نے دشمن کو خبردار کرنے کے لیے توپ چلانے کا حکم دیا۔ توپ کی آواز سن کر کشتیاں واپس چلی گئیں اور دشمن کے جہازوں [illegible] ی شروع کردی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد دشمن کے دو جہاز بھی بندرگاہ کے سامنے پہنچ گئے جنھوں نے رات کے وقت شمال کی ساحلی چوکیوں پر گولہ باری کی تھی۔ قلعے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ساٹھ اور زخمیوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ صدیق علی دوربین لیے ایک برج پر کھڑا توپچیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ افتخارالدین بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔

"دیکھیے ایک جہاز ساحل کے قریب آرہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" صدیق علی نے جواب دیا۔ "لیکن اُدھر دیکھو وہ دو جہاز

اب پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ بری طرح شکستہ ہو چکا ہے۔

افتخارالدین نے کہا: "مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میری حیثیت ابھی تک ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ کاش میری بندوقوں کی گولیاں دشمن تک پہنچ سکتیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا: "تمھارے امتحان کا وقت آرہا ہے، اس لڑائی کا آخری فیصلہ تلواروں اور بندوقوں سے ہی ہوگا۔"

صدیق دوربین لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک ہلکی سی چیخ اور اس کے ساتھ ہی کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، افتخار منہ کے بل پڑا تھا۔ صدیق علی نے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ خون سے تر ہو گئے۔

"افتخار! افتخار!" اس نے اسے پیٹھ کے بل لٹاتے ہوئے کہا لیکن افتخار کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

"اسے نیچے لے جاؤ!" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سپاہیوں سے کہا۔

صدیق علی چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر دوربین لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فضا بیک وقت قلعے کی کئی توپوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی ۔

بیسواں باب

بڈنور کا گورنر ایاز خاں اپنے محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا، اس کی آنکھوں سے ایک بھیڑیئے کی سفاکی اور اس کے چہرے سے ایک لومڑی کی عیّاری مترشح تھی۔ ناصرالدین کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا۔ "میں ساری رات نہیں سو سکا کہیے کنڈاپور سے کوئی خبر آئی ؟"

"نہیں ! میں حیران ہوں کہ میرے ایلچی نے اتنی دیر کیوں لگائی !"

"میرے خیال میں آپ کی کمک پہنچ گئی ہوگی ۔"

ایّاز خاں نے جواب دیا۔ "کمک بھیجنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے قلعے کے محافظ کو یہ حکم بھیج دیا تھا کہ وہ فوج وہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائے ۔"

"لیکن مجھے تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ کمک بھیج رہے ہیں ۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب میں قلعے کی حفاظت بے سود سمجھتا ہوں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قلعے کے نئے محافظ کی حماقت کی وجہ سے بہت سی جانیں ضائع ہو جائیں گی اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ آپ افتخار الدین کو ایسے آدمیوں کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ بہرحال آپ کو فکرمند نہیں ہونا چاہیئے ، مجھے یقین ہے کہ قلعے کی فوج اب حیدر گڑھ پہنچ چکی ہوگی اور میں نے افتخار الدین کے لیے یہ حکم بھیج دیا ہے کہ وہ فوراً یہاں آجائے ۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے کنڈاپور خالی کرنے کا حکم بھیجا ہے تو صدیق علی آپ کے ایلچی پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آئے گا کہ آپ ایسی غلطی کر سکتے ہیں ۔"

ایاز خاں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اس بیوقوف کو پھانسی دینے کے لیے کون سی جگہ موزوں رہے گی ۔"

ناصرالدین نے کہا۔ "اس نے ایک محبِ وطن سپاہی کا فرض ادا کیا ہے اور وہ سزا کی بجائے انعام کا مستحق ہے۔ قلعہ دار کی غداری کے بعد اس کا وہاں پہنچنا تائیدِ غیبی تھا۔"

ایاذ خاں نے کہا۔ "آپ تشریف رکھیے ! میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔"

ناصرالدین ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایاز خاں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہاں پہنچتے ہی آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے میرے ساتھ غداری نہیں کی تھی ۔"

ناصرالدین چند ثانیے سکتے کے عالم میں ایاز کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی ؟"

"ہاں"

"اور آپ کا حکم یہ تھا کہ کنڈاپور کا قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دیا جائے ؟"

"جی ہاں ۔"

ناصرالدین اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ایاز خاں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوبارہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ زندگی میں ہمیں بسا اوقات

ایسی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔" ناصر الدین نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ میسور ساری دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ وہ چند جہاز جو آپ نے کنڈاپور کی بندرگاہ میں دیکھے تھے، ایک زبردست جنگی بیڑے کے ہراول تھے۔ انگریزوں کی فوج چند دن تک یہاں پہنچ جائے گی۔ ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر ان کا قابض ہو جانا یقینی ہے۔ سلطان ٹیپو جنوب اور مشرق کے تمام علاقے خطرے میں ڈالے بغیر اس طرف نہیں آسکتا۔ اب ہمیں میسور کی بجائے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہیئے!"

ناصر الدین نے کہا۔ "میں اپنا مستقبل میسور کے ساتھ وابستہ کر چکا ہوں۔"

"نہیں! آپ کا مستقبل بڈنور کے صوبیدار کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔"

"لیکن ان حالات میں جب کہ انگریزی فوجیں ......!"

ایاز خاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ انگریز مجھ سے بڈنور کی صوبیداری نہیں چھینیں گے۔"

"ان حالات میں میرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ افتخار الدین کے یہاں پہنچتے ہی واپس منگلور چلا جاؤں گا۔"

"آپ رضیہ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟"

ایک ثانیہ کے لیے ناصر الدین کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ بالآخر اس نے کہا۔

"رضیہ میرے ساتھ جائے گی۔"

"نہیں! رضیہ یہیں رہے گی اور آپ بھی یہیں رہیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اب آپ منگلور واپس جانے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائیں۔

منگلور آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے انگریزوں کے قبضہ میں جا چکا ہوگا۔"

"ہم کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔"

"اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ کی صاحبزادی کے لیے اس ملک میں بڈنور سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے تو میں اسے بخوشی وہاں بھیج دوں لیکن وہ اس محل میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ کو میرے متعلق کوئی شبہ ہے تو میں آج اسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کہ آپ لوگ اس محل سے باہر ایک معمولی سے مکان میں رہیں۔"

باہر پہرہ داروں کا شور سنائی دیا۔ کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "میں اسی وقت صوبیدار سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ بیوقوفو! میں کنڈاپور سے آیا ہوں!"

ایاز خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے چار پہرے دار ننگی تلواریں بلند کیے ہوئے تھے۔ ایاز نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ نوجوان چند قدم آگے بڑھا اور ایاز خاں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ناصر الدین نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ مسعود علی تھا۔

ایاز نے پوچھا۔ "تم کنڈاپور سے آئے ہو؟"

"جی ہاں! وہاں حالات بہت مخدوش ہیں۔ ہمارا بارود ختم ہو چکا ہے۔ دشمن کے جنگی بیڑے کے پانچ اور جہاز وہاں پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے تین بار قلعے کے آس پاس مختلف مقامات پر فوجیں اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن ہم نے انھیں ہر بار سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ قلعے کے محافظ اس وقت ملبے کے ڈھیروں پر مورچے بنا کر لڑ رہے ہیں۔ ہمارے نصف سے زیادہ سپاہی زخمی اور ہلاک ہو چکے ہیں۔ ہمیں بہت جلد پیچھے ہٹ کر ساحل پر اترنے والی فوج کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنا پڑے

گی۔ ہم کمک کا انتظار کر رہے تھے لیکن کل چند غدار آپ کے ایلچیوں کا بھیس بدل کر وہاں پہنچے اور انھوں نے ہمیں آپ کا یہ حکم دیا کہ ہم میدان چھوڑ دیں اور تین حصوں میں تقسیم ہو کر حیدر گڑھ۔ امنت پور اور ادنور پہنچ جائیں۔ یہ حکم نہایت عجیب تھا۔ کماندار نے ان آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے اور مجھے آپ کے پاس تصدیق کے لیے بھیجا ہے۔"

ایاز خاں کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "اب اگر تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ تمھیں بھی غدار نہیں سمجھے گا تو تم فوراً واپس جا کر اسے میرا یہ حکم دو کہ وہ کنڈا پور خالی کر دے اور سیدھا میرے پاس آئے۔ تم وقت ضائع نہ کرو۔ تمھارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟"

مسعود علی نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ صرف دو آدمی ہیں۔"

ایاز خاں نے پہرے داروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم ان کے ساتھ جاؤ اور اصطبل کے داروغہ سے کہو انھیں تازہ دم گھوڑے دے دے۔"

پہریدار کمرے سے باہر نکل گئے لیکن مسعود علی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں ناصر الدین پر مرکوز تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "میں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کو تلاش کیا تھا آپ گھر پر نہیں تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے اچھی خبر لے کر نہیں آیا ... افتخار الدین شہید ہو چکا ہے۔"

"مجھے معلوم تھا۔" ناصر الدین نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

ایاز خاں انتہائی پریشانی کی حالت میں کبھی ناصر الدین کی طرف اور کبھی مسعود علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناصر الدین اٹھا اور کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھا ایاز خاں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "نہیں! خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے چند گھنٹے تنہائی کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر ناصر الدین باہر نکل گیا۔ مسعود علی اس کے پیچھے جانے لگا لیکن ایاز خاں نے کہا۔ "نوجوان ٹھہرو! میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"

"ناشتا مجھے راستے میں مل جائے گا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"تم ناصر الدین کے گھر میں یہ خبر دے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اب واپسی پر بھی وہاں جاؤ گے؟"

"جی نہیں! اگر وہ یہاں نہ ملتے تو بھی میرے پاس انھیں تلاش کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔"

"مجھے ان کے بیٹے کی موت کا بڑا افسوس ہے۔ اچھا تم جاؤ اور کنڈا پور کے محافظ سے کہو کہ میں اس سے خفا بھی ہوں اور خوش بھی۔ خفا اس بات پر کہ اس نے میرے ایلچیوں کو قید کر دیا ہے اور خوش اس بات پر کہ اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے لیکن اب اسے قلعہ خالی کرنے کے متعلق میرے احکام کی تعمیل کرنی چاہیئے۔"

* * *

تھوڑی دیر بعد مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر سے باہر نکل رہے تھے تو انھیں سامنے ایک سوار دکھائی دیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے چلّا کر کہا۔ "مسعود علی صاحب ٹھہریئے!"

مسعود علی نے گھوڑا روکا اور سوار نے کہا۔ "میں ناصر الدین کا نوکر ہوں۔ وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ آپ تھوڑی دور آگے چل کر ان کا انتظار کریں۔"

"وہ یہاں آئیں گے؟"

"ہاں! چلیے ذرا آگے نکل چلیں۔"

کوئی آدھ میل چلنے کے بعد ناصرالدین کے نوکر نے کہا "بس اب یہیں ٹھہر جائیے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے۔"

مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد مسعود علی نے کہا۔ "ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔ ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔"

نوکر نے کہا۔ "جناب انھوں نے یہ کہا تھا کہ آپ کو روکنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر میں آپ کو نہ روک سکا تو بدنور اور ملیبار کی تباہی یقینی ہے۔"

مسعود علی کے ایک ساتھی نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "شاید کوئی آ رہا ہے۔"

مسعود علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک سوار پوری رفتار سے آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو مسعود علی نے کہا لیکن یہ ناصرالدین تو نہیں معلوم ہوتے۔ ارے یہ تو کوئی عورت ہے!"

نوکر نے کہا "یہ ناصرالدین کی صاحبزادی ہیں۔"

مسعود علی اور اس کے ساتھی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رضیہ نے گھوڑا روکا اور کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "چلیے!"

"کہاں؟" مسعود علی نے سوال کیا۔

"کنڈاپور۔"

"آپ ہمارے ساتھ جائیں گی؟"

"ہاں، وقت ضائع نہ کیجیے!"

"لیکن کنڈاپور میں اب عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"آپ کا بھائی وہاں ہے؟"

"ہاں۔"

"اباجان! نے مجھے ایک ضروری پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا ہے۔ خدا کے لیے اب وقت ضائع نہ کیجیے!"

مسعود علی کچھ کہے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

تھوڑی دیر بعد ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ مسعود علی اور اس کے ساتھی اپنے رسالے کے بہترین سوار تھے لیکن ان کے نزدیک رضیہ کی ہمت قابلِ داد تھی۔ مسعود علی کے ذہن میں کئی سوال تھے جو وہ رضیہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن جب وہ حزن و ملال کی اس تصویر کو دیکھتا تو اسے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ راستے کی پہلی چوکی پر وہ گھوڑے بدلنے کے لیے رکے۔ مسعود علی اور اس کے ساتھیوں کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ مسعود علی نے چوکی کے محافظ کو کھانا لانے کے لیے کہا اور پھر رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میرے خیال میں آپ بھی کچھ کھا لیں۔"

"مجھے بھوک نہیں! آپ جلدی کریں!"

شام کے وقت وہ کنڈاپور سے تھوڑی دور ایک چوکی میں پہنچ گئے۔ مسعود علی نے رضیہ کو ایک کمرے میں پہنچا کر کہا۔ "آپ کو آرام کی ضرورت ہے، آپ کھانا کھا کر سو جائیں میں آپ کا نوکر اور اپنا ایک ساتھی آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ خدا معلوم وہاں حالات کیسے ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس آدمی بھیج دوں گا۔ اگر آپ کے پاس کوئی ضروری اطلاع ہے تو مجھے بتا دیجیے۔"

رضیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔"

مسعود علی نے کہا۔ "میں افتخار الدین کی بہن کو ناراض نہیں کر سکتا لیکن کاش مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ کنڈاپور آپ کے لیے محفوظ ہے۔ آپ کے لیے اپنے بھائی کی موت

یقیناً ایک بہت بڑا سانحہ ہے لیکن وہاں جاکر آپ کا غم غلط نہیں ہوسکتا۔ آپ کے اباجان اگر وہاں کوئی ضروری پیغام پہنچانا چاہتے تھے تو اس کے لیے آپ کا بھیجنا بھی ضروری نہ تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کر سکتے تھے۔"

رضیہ نے مضطرب ہوکر کہا۔ "آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ میرا فوراً کنڈاپور پہنچنا ضروری ہے۔"

مسعود علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر آپ کسی خطرے سے بھاگ رہی ہوں تو بھی آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ میں صدیق علی کا بھائی ہوں۔"

رضیہ نے مسعود علی کی طرف دیکھا اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ چند ثانیے ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ایک سپاہی کھانے کا طشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی نے اس کے ہاتھ سے طشت لے کر رضیہ کے سامنے رکھ دیا۔ سپاہی واپس چلا گیا۔ مسعود علی نے رضیہ کی طرف متوجہ ہوکر کہا: "اگر آپ کو میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

رضیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اگر آپ پر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ یہاں تک کیوں آتی؟ سنیئے! اباجان نے محل سے واپس آتے ہی مجھے بتایا تھا کہ ایاز انگریزوں کے ساتھ بدنور کا سودا کرچکا ہے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ ایاز بدنور کے تمام قلعے انگریزوں کے قبضہ میں دینے کا فیصلہ کرچکا ہے۔"

مسعود علی کچھ دیر سکتے کے عالم میں رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "یہ خبر نہایت الم ناک ہے۔ لیکن اس کے لیے آپ کو کنڈاپور جانے کی ضرورت نہ تھی۔"

رضیہ نے کہا۔ "آپ نہیں جانتے۔ اس وقت بدنور کی تمام فوج مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ اباجان نے محل سے آتے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ غدار اب زبردستی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے میرے لیے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ اباجان

کو یقین تھا کہ آپ کے بھائی جان مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں گے۔ جب اباجان ایاز کے ساتھ میری منگنی کر رہے تھے تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے اور میں بھی یہ سوچتی تھی کہ میں خوش قسمت ہوں۔ خدا کے لیے مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دیجیے جو اس قوم فروش کی دسترس سے باہر ہو۔"

مسعود علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ اب آپ کو کوئی خطرہ نہیں لیکن میں آپ کے والد کے متعلق پریشان ہوں۔ وہ آپ کے ساتھ کیوں نہ آئے؟"

"انھیں یہ ڈر تھا کہ ایاز بہت جلد ہمارے گھر آئے گا۔ وہ اسے غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے وہاں ٹھہرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اگر انھیں موقع ملا تو وہ آج رات وہاں سے روانہ ہوکر خشکی کے راستے سیدھے منگلور کا رخ کریں گے اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر منگلور کو کوئی خطرہ درپیش ہوا تو وہ سرنگاپٹم چلے جائیں گے۔"

مسعود علی نے کہا۔ "میں گھوڑے دیکھتا ہوں۔ اب شاید ہمارا سفر بہت طویل ہو جائے۔ آپ چند نوالے ضرور کھا لیجیے!"

"مجھے بالکل بھوک نہیں۔ آپ جلدی تیاری کریں۔"

* * *

چند منٹ بعد مسعود علی، رضیہ اور ان کے ساتھی رات کی تاریکی میں گھوڑوں پر سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوئے اور قریباً چار میل سفر کرنے کے بعد جب وہ ایک ندی کے پل کے قریب پہنچے تو کسی نے بلند آواز میں کہا۔ "ٹھہرو، کون ہے؟"

مسعود علی نے گھوڑا روک کر جواب دیا۔ "میں مسعود علی ہوں۔"

چار مسلح سپاہی آگے بڑھے اور ان میں سے ایک نے کہا۔ "آپ کمانڈار صدیق علی خاں کے بھائی ہیں؟"

"ہاں ــــ اور تم کنڈاپور کی فوج کے آدمی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"یہاں کر رہے ہو؟"

"فوج یہاں آگئی ہے اور ہم پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے ہیں۔"

"قلعہ خالی ہو چکا ہے؟"

"جی ہاں! قلعے میں اب ملبے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ہم غروب آفتاب کے بعد وہاں سے نکل آئے تھے۔"

مسعود علی اپنے بھائی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ رضیہ نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "صدیق علی خاں کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں ہیں۔" سپاہی نے جواب دیا۔

مسعود علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان کے پاس لے چلو!"

"چلیئے!"

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ صدیق علی خاں اور فوج کے چند افسروں کے سامنے کھڑے تھے اور رضیہ انھیں ایاز خاں کی غداری کی داستان سنا رہی تھی۔ رضیہ کا بیان سننے اور مسعود علی سے چند سوالات کرنے کے بعد صدیق علی نے کہا۔ "مسعود تم بہت تھکے ہوئے ہو لیکن تمھیں آج رات آرام نہیں ملے گا۔ تم پانچ سواروں کے ساتھ اسی وقت شیموگہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور وہاں قلعے کے محافظ کو موجودہ صورت حالات سے خبردار کرو۔ اسے میری طرف سے یہ پیغام دو کہ انگریز ملیبار اور بدنور کے کئی ساحلی مقامات پر فوجیں اتار چکے ہیں۔ ہم نے کنڈاپور اس وقت خالی کیا ہے جب کہ دشمن کی توپیں قلعے کو ملبے کا ڈھیر بنا چکی تھیں اور ان کی فوج کنڈاپور کے شمال اور جنوب میں کئی مقامات پر اتر چکی تھی اور ہمارے لیے رسد اور کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ ہم قلعے کی توپیں نکال کر حیدر گڑھ اور بدنور لے جانا چاہتے تھے لیکن اب وہ شیموگہ بھیج

دی جائیں گی۔ اس وقت ہمارے ساحل کی کوئی چوکی محفوظ نہیں۔ ایاز خاں کی غداری کے بعد ہمارے لیے بدنور کو بچانا ممکن نہیں لیکن میں بدنور کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج پر عقب سے حملے کر کے اسے زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لیے مصروف رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میرے پاس اس وقت صرف ساڑھے تین سو سوار اور آٹھ سو پیادہ سپاہی ہیں، زخمیوں کو ایک دستے کی حفاظت میں شیموگہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارے پاس بارود کی کمی ہے۔ اس لیے جب تک کمک نہیں پہنچتی ہم دشمن کے عقب پر اکا دکا حملوں پر اکتفا کرتے رہیں گے۔"

مسعود علی نے کہا۔ "آپ نے افتخار الدین کی ہمشیرہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "اب اننت پور بھی زیادہ محفوظ نہیں۔ اس لیے ہمیں شیموگہ کو ہی اپنا فوجی مستقر بنانا پڑے گا۔ زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا، میں رضیہ کو ان تک پہنچانے کا انتظام کر دیتا ہوں۔" پھر وہ ایک افسر کی طرف متوجہ ہوا۔ "انھیں قافلے کے ساتھ شامل کرنا تمھارے ذمہ ہے۔ اپنے ساتھ چار سپاہی لے کر ابھی روانہ ہو جاؤ!"

رضیہ نے کہا۔ "میں یہیں رہ کر اباجان کا انتظار کروں گی۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "ہم دو تین گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ میں نے کنڈاپور سے شمال کی طرف اترنے والی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے چند جاسوس بھیجے ہیں اور ان کی طرف سے اطلاع ملتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

رضیہ نے کہا۔ "میں لڑائی میں آپ کی فوج کا ساتھ دے سکتی ہوں۔"

"نہیں! ابھی ہماری بہنوں کے لیے تلوار اٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہماری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں۔"

رضیہ نے کہا۔ "اگر آپ مجھے شیموگہ بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے قافلے کے

ساتھ بھیجنا ضروری نہیں۔ میں آپ کے بھائی کے ساتھ سفر کر سکتی ہوں"۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوگی، مسعود راستے میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکے گا لیکن اگر آپ مسعود کا ساتھ دے سکیں تو اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ شموگا کے قلعہ دار کو کسی اور کی نسبت زیادہ متاثر کر سکیں گی"۔

رضیہ نے کہا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر اباجان آپ کے پاس پہنچیں تو انھیں میرے متعلق بتا دیجیے"۔

صدیق علی نے کہا۔ "بہت اچھا ــــ! مسعود علی اب تم انھیں لے کر روانہ ہو جاؤ!"

مسعود علی کو روانہ کرنے کے دو گھنٹہ بعد صدیق علی کو جاسوسوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ انگریزی افواج جنرل میتھیوز کی قیادت میں حسن گدی کے درّے کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال چکی ہیں۔ اس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔

علی الصباح جب جنرل میتھیوز کی افواج درّے کی ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہی تھیں۔ میسور کے سپاہیوں نے آس پاس کی چوٹیوں سے اچانک نمودار ہو کر ان کے عقب کے دستوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ انگریزی فوج نے پلٹ کر حملہ کرنے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہ درّہ دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔ اور سات میل تک جگہ جگہ توپیں نصب تھیں۔ صدیق علی نے اس امید پر دشمن کا تعاقب جاری رکھا کہ شاید ایاز خاں کی غداری کے باوجود کسی چوکی کے سپاہی دشمن کا راستہ روکنے کی کوشش کریں لیکن اس کی یہ توقع عبث ثابت ہوئی۔ جنرل میتھیوز کے لیے راستہ کھلا تھا۔ وہ عقب سے بار بار حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ الجھنا اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔

صدیق علی کے سپاہی قریباً ڈیڑھ سو انگریزوں کو ہلاک اور زخمی کرنے کے بعد ان کے بارود سے لدے ہوئے چند خچر چھین چکے تھے لیکن جنرل میتھیوز کو ان نقصانات

کی پروا نہ تھی۔ انگریزی فوج درّے سے نکل کر حیدر گڑھ کے قلعے میں داخل ہوئی حیدر گڑھ کے قلعے کے سترہ سو محافظوں میں سے اکثر ایاز خاں کے حکم کے مطابق بدنور پہنچ چکے تھے۔ باقی قلعے کے دروازے پر دشمن کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ یہ قلعہ ایک بلند مقام پر تھا اور اپنے محلِ وقوع کے باعث ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس میں پچیس توپیں نصب تھیں لیکن قلعہ دار نے انھیں صرف دشمن کو سلامی دینے کے لیے استعمال کیا۔ حیدر گڑھ سے آگے بدنور کا راستہ انگریزوں کے لیے کھلا تھا اور صدیق علی کے تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے ان کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔

۲۸ جنوری ۱۷۸۳ء کی شام بدنور کے باشندے حسرت و یاس کے عالم میں قلعے کے دروازے پر میسور کی بجائے انگریزوں کا جھنڈا دیکھ رہے تھے اور ایاز خاں کمپنی کی فوج کے افسروں کو بدنور کا سرکاری خزانہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔

* * *

مسعود علی نے شموگا کے قلعے میں داخل ہوتے ہی کمانڈر سے ملاقات کی اور اس نے نئے حالات سے باخبر ہوتے ہی سلطان ٹیپو اور ملیبار کی فوجی چوکیوں کے محافظوں کو خبردار کرنے کے لیے اپنے ہرکارے روانہ کر دیئے۔ رضیہ کو اس نے اپنے مکان میں جگہ دی۔

دو دن بعد کنڈاپور کے زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ شموگا پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی قلعے کے محافظ کو یہ اطلاع ملی کہ بدنور اور حیدر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ چوتھے روز سلطان کی فوج کا ایک افسر لطف علی چند دستوں کے ساتھ چتل ڈرگ سے یلغار کرتا ہوا شموگا پہنچ گیا اور اس نے قلعے کے محافظ کو یہ خوشخبری سنائی کہ سلطان کا لشکر بہت جلد پہنچنے والا ہے۔

اگلے روز رضیہ قلعہ دار کے گھر میں عصر کی نماز پڑھ رہی تھی کہ اسے باہر "فو

آرہی ہے، فوج آرہی ہے" کا شور سنائی دیا۔ وہ نماز ختم کرکے اٹھی اور قلعہ دار کی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ مکان کے دروازے میں کھڑی ہوکر وسیع احاطے کی طرف جھانکنے لگی۔

مسعود علی چند افسروں کے ساتھ صحن میں کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صدیق علی گھوڑا دوڑاتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہوا اور رضیہ اسے دیکھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگی۔ پھر چند ثانیے بعد سواروں کے دستے داخل ہو رہے تھے اور رضیہ کی نگاہیں ان میں اپنے باپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مسعود علی بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ صدیق علی نے اسے دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور نیچے اتر کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ رضیہ اپنے باپ کے متعلق سننے کے لیے بے تاب تھی اور اسے اپنا سانس بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ مسعود علی کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد صدیق علی نے قلعہ دار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگیا۔

رضیہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اچانک وہ مکان سے باہر نکل آئی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی صدیق علی کی طرف بڑھی۔ مسعود علی نے صدیق علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" بھائی جان! رضیہ آرہی ہے۔ وہ اپنے باپ کے متعلق بہت پریشان ہے۔"

صدیق علی نے مڑ کر رضیہ کی طرف دیکھا اور رضیہ کے پاؤں اچانک زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صدیق علی کا مغموم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صدیق علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔" رضیہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔"

"ابا جان کہاں ہیں؟" رضیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

صدیق علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔" مجھے افسوس ہے کہ میں انھیں

اپنے ساتھ نہیں لا سکا۔ اب وہ ہم سے بہت دور جا چکے ہیں۔ میں نے ان کا پتہ کرنے کے لیے بڈنور میں اپنا ایک جاسوس بھیجا تھا۔ تمھارے نوکروں نے اسے بتایا کہ انھوں نے اسی روز رات کے وقت بڈنور سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن شہر سے تھوڑی دور ایاز خاں کے آدمیوں نے انھیں جا لیا۔ وہ رات کی تاریکی میں سڑک چھوڑ کر ایک طرف بھاگنے لگے لیکن وہ گھوڑے سمیت ایک گہرے کھڈ میں جا گرے۔ ایک نوکر آخری وقت تک ان کے ساتھ تھا اور میرا جاسوس اس سے مل کر ان کی موت کی تصدیق کر چکا ہے۔"

رضیہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ مسعود علی اور قلعہ دار آگے بڑھے قلعہ دار نے کہا۔" بیٹی! مجھے تمھارے باپ کی موت کا افسوس ہے!"

رضیہ کوئی جواب دیئے بغیر مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی مکان کی طرف چل دی۔

◆

عشاء کی نماز کے بعد قلعہ دار مسجد سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔" میں ناصر الدین کی صاحبزادی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"چلیے! میری بیوی کہتی تھی کہ اس نے اپنے باپ کی موت کی خبر سننے کے بعد سے کسی سے بات نہیں کی۔ اگر آپ اسے تسلی دے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔"

صدیق علی، قلعہ دار کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ دار نے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔" وہ اس کمرے میں ہیں۔"

صدیق علی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"میں صدیق علی ہوں۔"

کمرے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور پھر نیم واکواڑ کی اوٹ سے رضیہ کی آواز آئی "میرا خیال تھا کہ آپ کہیں جا چکے ہیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "میں اس قلعے میں پناہ لینے والے زخمیوں کی مزاج پرسی میں مصروف تھا لیکن اگر میں کہیں چلا گیا ہوتا تو بھی یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی۔ جو حادثہ آپ پر گزرا ہے۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے لیکن کاش تسلی کے الفاظ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میں آپ کو یہ بتلانے آیا ہوں کہ اب شموگا اور اس کے آس پاس کوئی شہر یا قلعہ محفوظ نہیں۔ ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے بڈنور اور حیدر گڑھ سے انگریزی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی ہے لیکن ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا ان کی منزلِ مقصود کدھر ہے۔ ممکن ہے کہ دو ایک روز تک مجھے کسی اہم محاذ پر جانا پڑے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ مجھے آپ کے نوکر نے بتایا ہے کہ بنگلور میں آپ کے کوئی عزیز رہتے ہیں۔"

"بنگلور میں ہمارے رشتہ دار ہیں لیکن میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک انھیں نہیں دیکھا اور میں ان کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اس قلعے میں جان دینا آسان سمجھتی ہوں۔"

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر آپ کو کسی اور جگہ جانا پسند نہیں تو سرنگاپٹم میں ہمارے گھر کا دروازہ آپ کے لیے ہر وقت کھلا ہے، آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ میری امی جان آپ کی دلجوئی کر سکیں گی۔ اگر آپ کو وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کل ہی آپ کے سفر کا بندوبست کر دوں گا۔ آپ کا نوکر اور چند سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

صدیق علی، رضیہ کی طرف سے کسی جواب کی بجائے دروازے کی اوٹ میں

اس کی سسکیاں سن رہا تھا اور یہ سسکیاں آہستہ آہستہ دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

قلعہ دار نے کہا۔ "بیٹی! میں صدیق علی کے ابا جان کو جانتا ہوں۔ سرنگاپٹم میں ان کے گھر سے بہتر تمھارے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں ہو سکتی۔ شموگا اب ہماری فوج کا مرکز بننے والا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنے بچوں کو یہاں سے بھیج رہا ہوں۔"

قلعہ دار کا ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بولا۔

"ایک افسر دروازے پر کھڑا ہے اور وہ آپ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے ملاقات کے کمرے میں بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔"

نوکر چلا گیا تو قلعہ دار نے صدیق علی سے کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی اہم خبر سننے والے ہیں۔ آپ انھیں تسلی دیں میں اس سے پتہ کرتا ہوں۔"

قلعہ دار ملاقات کے کمرے کی طرف چل دیا اور صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "رضیہ اگر آپ کو ہمارے گھر جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

رضیہ نے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب اس دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ شاید بہت رحمدل ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں پتھر نہیں ہوں۔"

رضیہ نے کہا۔ "کاش میں آپ کی فوج میں شامل ہو کر اپنے بھائی اور باپ کا انتقام لے سکتی۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "آپ کے بھائی اور ابا جان کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔"

قلعہ دار کا نوکر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ "وہ آپ کو بلا رہے ہیں انگریزوں

کی پیش قدمی کے متعلق کوئی اہم خبر آئی ہے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "رضیہ! کاش میرے پاس باتوں کے لیے وقت ہوتا اگر مجھے اسی وقت کسی مہم پر جانا پڑا تو میری غیر حاضری میں قلعہ دار تمھارے سفر کا بندوبست کر دے گا۔" اس کے بعد اس نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "چلو!"

رضیہ چند منٹ کواڑ سے لگی کھڑی رہی۔ پھر اپنے بستر کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ سرنگا پٹم میں صدیق علی کے والدین اور اس کے گھر کی مختلف خیالی تصویریں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ جب جنگ کے بعد سپاہی اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو وہ صدیق علی اور مسعود کی ماں کے ساتھ بالکنی میں کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی اور اس کی نگاہوں کے سامنے امیدوں کے چراغ روشن ہو جاتے —اور کبھی وہ سوچتی کہ میدانِ جنگ سے کوئی ایلچی ایک عمر رسیدہ ماں کو آکر یہ پیغام دے گا کہ تمھارے جواں سال بیٹے لڑائی میں کام آ چکے ہیں اور اس کی نگاہوں کے سامنے بھیانک تاریکیاں چھا جاتیں۔ جہاز پر صدیق علی کے ساتھ ابتدائی ملاقات کو وہ ایک اتفاقی حادثہ سمجھتی تھی لیکن کنڈا پور سے رخصت ہوتے وقت اسے افسوس تھا کہ ان کے راستے ایک دوسرے سے اتنی جلدی جدا ہو گئے ہیں تاہم یہ احساس اتنا شدید نہ تھا کہ وہ مڑ کر پیچھے دیکھتی لیکن اب دنیا بدل چکی تھی اور صدیق علی اس کے لیے زندگی کا آخری سہارا بن چکا تھا۔ اپنے بھائی اور اپنے باپ کی موت کے بعد وہ بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ اگر صدیق علی نہ ہوتا تو یہ دنیا میرے لیے کتنی تاریک ہوتی!

وہ دیر تک اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتی رہی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد اسے قلعے کے صحن میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ "صدیق علی کہیں جا رہا ہے ۔۔۔ صدیق علی کسی خطرناک مہم پر جا رہا ہے، شاید وہ واپس نہ آئے" "نہیں! نہیں! صدیق علی تم مت جاؤ، اب دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں

اکیلی ہوں۔ میں اب افتخار الدین کی بہن اور ناصر الدین کی بیٹی نہیں ہوں۔ اب میرے لیے بڈنور کے گورنر کا محل نہیں ہے۔ میں ایک بے بس لڑکی ہوں۔" صدیق علی مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔ میں گولیوں کی بارش میں تمھارا ساتھ دے سکتی ہوں۔"

رضیہ کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ قلعے کے صحن میں داخل ہوئی۔ صدر دروازے پر سپاہیوں کی آوازیں اور قلعے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی تھی — رضیہ کی حالت اس مسافر کی تھی جس کا قافلہ اسے صحرا میں تنہا چھوڑ کر آگے جا چکا ہو۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا اور دم بھر کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیر کر روپوش ہو گیا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

رضیہ نے قلعہ دار کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ "میں — میں رضیہ ہوں۔ صدیق علی کہاں ہیں؟"

"وہ ایک مہم پر جا چکے ہیں لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، چلیے اندر، وہ مجھے آپ کے متعلق تاکید کر گئے ہیں۔ آپ کے سفر کا بندوبست ہو جائے گا۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

"وہ کہاں گئے ہیں؟"

"وہ اننت پور گئے ہیں۔ ابھی اننت پور کی فوج کا ایک افسر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ انگریزوں کی فوج اننت پور کا رخ کر رہی ہے اور بڈنور کا گورنر وہاں کے سپاہیوں کو یہ ہدایت بھیج چکا ہے کہ قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر انگریزوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ صدیق علی تین سو سواروں کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے اگر وہ وقت پر پہنچ گیا تو مجھے یقین ہے کہ اننت پور کا قلعہ بچا سکے گا۔"

"ان کا بھائی کہاں ہے؟"

"وہ بھی فوج کے ساتھ جا چکا ہے لیکن وہ آپ کو سرنگا پٹم پہنچانے کے لیے تین سپاہی چھوڑ گئے ہیں۔ صدیق علی نے اپنے والد کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر آپ کے نوکر کو دیا تھا۔"

رضیہ نے کہا۔ "اگر آپ مجھے ضرور بھیجنا چاہتے ہیں تو میں اسی وقت یہاں سے روانہ ہونا چاہتی ہوں۔"

"یہ وقت موزوں نہیں۔ آپ رات آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

" رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اننت پور میں ان کی مہم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

"اننت پور کا قلعہ ہمارا مضبوط ترین قلعہ ہے۔ وہاں ساٹھ بڑی توپیں نصب ہیں۔ اگر صدیق علی کے پہنچنے سے پہلے غداروں نے اسے دشمن کے حوالے نہ کر دیا تو ہم انگریزوں سے بدنور اور حیدر گڑھ کی شکست کا بدلہ لے سکیں گے۔"

رضیہ نے کہا: "میں پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی اور اس وقت آپ کو جگانا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے آپ سونے سے پہلے میرے ساتھ جانے والے سپاہیوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ پچھلے پہر تیار رہیں!"

"بہت اچھا! لیکن اگر آپ ایک دن اور ٹھہر سکیں تو ممکن ہے پرسوں تک میں آپ کے ساتھ ہی اپنے بال بچوں کو بھی روانہ کر دوں۔"

"نہیں! میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" رضیہ یہ کہہ کر واپس مڑی، قلعہ دار کے مکان کے سامنے اسے اپنا نوکر دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔ "میں آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ صدیق علی خاں کہیں چلے گئے ہیں وہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً سرنگا پٹم روانہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے والد کے نام مجھے یہ خط

لکھ کر دیا تھا۔ لیجیے!"

رضیہ نے کاغذ کا پرزہ اپنے نوکر کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔ "میں ابھی قلعہ دار سے مل چکی ہوں۔ تم جا کر تیاری کرو ہم پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد رضیہ اپنے کمرے کے اندر چراغ کی روشنی میں صدیق علی کا مختصر سا خط پڑھ رہی تھی:۔

"ابا جان اور امی جان! میں ایک بے سہارا لڑکی کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میرے پاس تفصیلات بیان کرنے کا وقت نہیں — رضیہ کو آپ کی محبت، شفقت اور نیک دعاؤں کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اسے مایوس نہیں کریں گے

آپ کا بیٹا

صدیق علی"

صدیق علی اننت پور کے قلعے کے دروازے کے برج پر کھڑا مغرب کی سمت انگریز سواروں کی فوج دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہراول دستے معمولی رفتار سے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے ایک سوار سفید جھنڈا بلند کیے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ سوار قلعے کی توپوں اور بندوقوں کی زد میں آ چکے تھے۔ صدیق علی کے اشارے پر چند سپاہیوں نے ہوائی فائر کیے۔ اس کے بعد ایک توپ چلائی گئی اور انگریزی فوج جو اطمینان سے آگے بڑھ رہی تھی، رک گئی۔ چند منٹ بعد انگریزی فوج کے چار سوار جن میں سے ایک کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑے دوڑاتے ہوئے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے اور ان میں سے ایک نے جو فوج کا کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا، بلند آواز میں کہا۔ "سفید جھنڈے پر گولی چلانا جنگ کے اصولوں کے خلاف ہے۔ تمہارا کماندار ہمارے ساتھ وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قلعہ ہمارے

حوالہ کر دے گا۔ اگر کمانڈر کی نیت بدل گئی ہے تو یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی جو بڈنور کے گورنر نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "بڈنور کا گورنر حکومتِ میسور کا غدار ہے اور اس کمانڈر کو پھانسی دی جا چکی ہے۔ جس نے ایک غدار کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے تمھارے سفید جھنڈے پر گولی نہیں چلائی بلکہ تمھیں خبردار کیا تھا کہ تم اس امید پر قلعے کی توپوں کی زد میں آنے کی کوشش نہ کرو کہ یہاں سب غدار بستے ہیں۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "ایاز خاں نے بڈنور کے گورنر کی حیثیت سے اس کے قلعے کے متعلق ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور میسور کی حکومت اپنے ایک بااختیار گورنر کی طرف سے کیے گئے معاہدوں کی پابند ہے۔"

"بڈنور کے گورنر کی سرکاری حیثیت اس دن ختم ہو گئی تھی۔ جب اس نے تمھارے ساتھ بڈنور اور حیدر گڑھ کا سودا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک غدار ہے۔"

"ہم تمھیں خبردار کرتے ہیں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ تم چند گھنٹوں سے زیادہ ہمارے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم تمھیں پندرہ منٹ سوچنے کے لیے مہلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم نے مزاحمت کی تو ہم بدعہدی کے جرم میں اس قلعے کے کسی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

صدیق نے جواب دیا۔ "اگر تم دو منٹ کے اندر اندر واپس نہ چلے گئے تو میں سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دوں گا۔"

انگریز سپاہیوں نے چند ثانیے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔

اچانک صدیق علی کو دائیں طرف حدِ نگاہ پر چند سوار دکھائی دیئے۔ اس نے ایک افسر کے ہاتھ سے دوربین لی اور افق کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ہمارے آدمی معلوم ہوتے ہیں اس نے بلند آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد اسے پانچ سوار اچھی طرح دکھائی دینے لگے اور پھر اچانک وہ اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد اس نے دوربین نیچے کرتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مسعود! رضیہ نے میرا کہا نہیں مانا۔ نیچے جا کر پہریداروں سے کہو کہ وہ انھیں اندر آنے دیں۔ انگریز محاصرے کے لیے اپنی صفیں درست کر رہے ہیں اور ابھی شاید ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی لیکن ممکن ہے کہ وہ انھیں قلعے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں!"

مسعود علی جلدی سے نیچے اتر گیا اور صدیق علی اضطراب کی حالت میں کبھی اپنے بائیں ہاتھ انگریزوں کی فوج کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی دائیں جانب قلعے کی سمت آنے والے پانچ سواروں کی طرف۔ اب وہ دوربین کے بغیر بھی رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو پہچان سکتا تھا۔ اچانک انگریزوں کی فوج کے چند سوار گھوڑے بھگاتے ہوئے آگے بڑھے اور انھوں نے رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن فصیل پر سے گولیوں کی بارش کے باعث انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز سپاہیوں نے جواب میں گولیاں برسائیں لیکن اتنی دیر میں رضیہ اور اس کے ساتھی قلعے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ صدیق علی بھاگتا ہوا صحن میں پہنچا۔ اسے اپنے جذبات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ رضیہ کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ چند ثانیے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ اجنبی لوگوں کے درمیان کھڑی ہے۔ پھر اس نے صدیق علی کی طرف دیکھا اور جلدی سے گردن نیچی کر کے اپنا نقاب درست کرنے لگی۔ مسعود علی نے اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے سہارا دیا اور صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "رضیہ تم نے بہت برا کیا۔ اس قلعے میں چار سو عورتیں اور بچے پہلے ہی پناہ لے چکے ہیں اور خدا معلوم اس کی دیواریں کب تک دشمن کی گولہ باری کے سامنے ٹھہر سکیں۔"

رضیہ نے جواب دیا۔ "میں اس قلعے میں پناہ لینے نہیں آئی۔ آپ میرا نام اپنے سپاہیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر آپ عورتوں اور بچوں کی خبر گیری کر سکیں تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔ مسعود! انھیں خواتین کے پاس پہنچا دو!"

"چلیے!" مسعود علی نے کہا اور رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف چل پڑی جہاں عورتیں اور بچے ٹھہرے ہوئے تھے۔

صدیق علی نے اپنے افسروں اور سپاہیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرے دوستو! ہمارے عزم اور استقلال کے امتحان کا وقت آ پہنچا ہے۔ میں یہ ہدایت لے کر آیا ہوں کہ جب تک ہمارا لشکر یہاں نہیں پہنچتا اس قلعے کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔ اگر یہ قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا تو یہ تمام علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ انگریز کو فتوحات کا شوق ہزاروں میل دور سے یہاں تک لے آیا ہے۔ اس نے سات سمندر پار اپنی قوم کی سطوت کے پرچم لہرانے کے لیے ہمارے ساتھ جنگ مول لی ہے اور اس جنگ میں فتح یا شکست اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں لیکن ہم اپنی عزت، اپنی آزادی اور اپنے بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے یہ ثابت کرنا ہے کہ تم جس جنگل میں شکار کھیلنے آئے ہو، وہاں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ نہیں، شیر بستے ہیں۔ ایک سپاہی کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اسے فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تمھیں یہ نہیں بتا سکتا کہ اننت پور میں ہماری جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے ہمیں بروقت کمک پہنچ جائے اور ہم دشمن کو دھکیل کر سمندر کی طرف لے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ دونوں صورتوں میں ہماری آئندہ نسلیں ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکیں گی کہ ہم نے ذلت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں تمھیں

اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس قلعے کے ہر سپاہی کی قربانی قوم کے ہزاروں افراد کو تباہی اور بربادی سے بچا سکے گی۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ دشمن ہماری لاشیں روندے بغیر اننت پور سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

* * *

ایک گھنٹہ بعد لڑائی شروع ہو چکی تھی اور انگریزوں کی توپیں چاروں طرف سے قلعے پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ قلعے میں بارود کے ذخیرے کا اندازہ لگانے کے بعد صدیق علی سپاہیوں کو یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وہ اشد ضرورت کے بغیر فائر نہ کریں۔ تیسرے پہر انگریزوں نے چاروں طرف سے قلعے پر دھاوا بولنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی توپوں نے پہلی بار پوری شدت سے گولہ باری کی اور حملہ آوروں کو شدید نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد دشمن صرف اپنے توپخانے سے گولے برسانے پر اکتفا کرتا رہا۔ غروبِ آفتاب کے وقت صدیق علی اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے قلعے کے ایک برج پر کھڑا تھا۔ قلعے کے گرد دشمن کی تعداد پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی اور وہ چاروں طرف چھوٹی توپوں کی جگہ بھاری توپیں نصب کر رہے تھے۔ مغرب کی اذان سن کر صدیق علی فصیل سے نیچے اترا اور نمازیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک باہر سے توپ کا ایک گولہ فصیل کے ایک برج پر لگا اور اس کے ریزے اڑ کر صحن میں آ گرے۔ پھر پوری شدت کے ساتھ چاروں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ نماز ختم کرنے کے بعد سپاہی اور افسر اپنے اپنے مورچوں میں کھڑے ہو گئے۔

یہ رات قیامت کی رات تھی۔ دشمن کا توپخانہ اندھا دھند آگ برسا رہا تھا۔ قلعے کے کئی برج ٹوٹ چکے تھے۔ چھتوں اور فصیلوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے۔ کئی سپاہی زخمی اور شہید ہو چکے تھے۔ پچھلے پہر صدیق علی فصیل کا چکر لگانے کے بعد نیچے اترا اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر قلعے کے اندر گشت کرنے لگا۔ جگہ جگہ

اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد وہ ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا جہاں چند عورتیں زخمیوں کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک سپاہی جس کی قمیص خون سے تر تھی، درد سے کراہ رہا تھا اور رضیہ اس کے سر پر پٹی باندھ رہی تھی۔ صدیق علی اس کے قریب پہنچ کر رکا۔ رضیہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ واپس مڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ فصیل پر پہنچا اور چاروں طرف چکر لگانے اور سپاہیوں کو ہدایات دینے کے بعد دروازے کے قریب ایک بُرج کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں قلعے کے چاروں طرف توپوں کے دہانوں سے آگ کے شعلے اژدہوں کی پھنکار سے زیادہ مہیب معلوم ہوتے تھے۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔

"کون ہے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"میں ہوں رضیہ" کسی نے گھٹی ہوئی نسوانی میں جواب دیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "میں تم سے خفا نہیں ہوں رضیہ! لیکن تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"لیکن یہاں سینکڑوں عورتیں موجود ہیں۔ میرے آنے سے کیا فرق پڑ گیا ہے؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "یہ عورتیں اننت پور کی طرف دشمن کی اچانک پیشقدمی کے باعث مجبوری کی حالت میں یہاں جمع ہو گئی ہیں لیکن تمھارے لیے ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ میں نے تمھیں اپنے گھر پہنچانے کا انتظام کر دیا تھا۔"

رضیہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں آکر مجھے موت کا ڈر نہیں میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہوں۔"

"میں تم سے خفا نہیں رضیہ! لیکن کاش میں تمھیں یہ سمجھا سکتا کہ ہم یہاں زندگی کی بجائے موت سے زیادہ قریب ہیں۔ دشمن اپنی پوری قوت یہاں جمع کر رہا ہے۔ خدا معلوم کل تک وہ کتنی اور بڑی توپیں اس قلعے کے سامنے نصب کر دے گا۔ ہمارا بارود کا ذخیرہ اب زیادہ سے زیادہ ایک دن اور چلے گا۔ میرے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہیں لیکن عورتوں اور بچوں کا مسئلہ ہمارے لیے بہت پریشان کن ہے۔ کاش تم میرا کہا مانتیں!"

رضیہ نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ میں یہاں کیوں آگئی ہوں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ہماری منزل ایک ہے اور ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔"

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "رضیہ تم صرف اس لیے یہاں آئی ہو کہ میں یہاں تھا؟"

صدیق علی کو جواب میں الفاظ کی بجائے سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کہا۔ "رضیہ سچ کہو تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں شاید اننت پور سے واپس آکر تمھیں نہ دیکھوں؟"

رضیہ کی سسکیاں اچانک بند ہو گئیں اور اس نے چند ثانیے توقف کے بعد جواب دیا۔ "مجھے صرف اس بات کا احساس تھا کہ آپ کسی خطرناک مہم پر روانہ ہو چکے ہیں اور میں خطرے کے وقت آپ سے دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ میری حفاظت کے خیال سے مجھے سرنگا پٹم بھیجنا چاہتے تھے لیکن آپ کے بغیر میرے لیے زندگی کے کوئی معنی نہ تھے۔"

اچانک ایک خوفناک دھماکا سنائی دیا اور اس کے بعد بُرج کے ایک ستون اور چھت کی کچھ اینٹیں نیچے گر پڑیں۔ پھر بیک وقت ایک کی زبان سے "رضیہ" اور دوسرے کی زبان سے "صدیق علی" کے الفاظ نکلے اور وہ اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی گرفت میں آچکے تھے۔

"رضیہ تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آپ کے متعلق ڈر گئی تھی۔ آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"

صدیق علی نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "رضیہ تم نیچے چلی جاؤ!"

"بھائی جان! بھائی جان!" چند قدم کے فاصلے سے مسعود علی کی آوازیں سنائی دیں۔

"کیا ہے مسعود؟"

مسعود تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ "بھائی جان یہ برج گر رہا ہے آپ ایک طرف ہٹ جائیں۔"

"بہت اچھا! تم رضیہ کو نیچے لے جاؤ!"

مسعود نے رضیہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، چلیے!"

رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ فصیل سے نیچے اتر آئی۔

صدیق علی آہستہ آہستہ فصیل پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ سپاہی اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور صدیق علی کو ان کا سکوت چیخوں سے زیادہ اضطراب انگیز محسوس ہوتا تھا۔ دشمن کی گولہ باری ہر لحظہ شدت اختیار کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ فصیل کے دوسرے حصے پر ایک افسر سے باتیں کر رہا تھا کہ

اچانک نیچے صحن سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ "کماندار صاحب! کماندار صاحب!!"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "میں یہاں ہوں! کیا بات ہے؟"

"مسعود علی خاں زخمی ہو گئے ہیں، آپ نیچے آئیں۔"

صدیق علی کا دل بیٹھ گیا۔ وہ جلدی سے نیچے اترا اور سپاہی کے ساتھ بھاگتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی جانکنی کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ چند سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے اور رضیہ ایک سکتے کے عالم میں اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"مسعود! مسعود!!" صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ مسعود علی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر چند ثانیہ بعد اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔ رضیہ کی پتھرائی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے صدیق علی کے قریب آکر کہا۔ "جناب اب صبح ہو رہی ہے اور دشمن کی نقل و حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعے پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

دن کے آٹھ بجے تک قلعے کی فصیل جگہ جگہ ٹوٹ چکی تھی۔ اندر کئی مکان ملبے کے ڈھیر بن چکے تھے۔ لڑنے والے سپاہیوں کی نسبت زخمی اور شہید ہونے والے مجاہدوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ کئی عورتیں اور بچے گرتی ہوئی چھتوں کے ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو چکے تھے۔ دوپہر کے وقت دشمن نے ایک بار پھر قلعے پر یورش کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کے محافظوں نے توپوں اور بندوقوں کی شدید فائرنگ سے انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کے محافظوں کی یہ کامیابی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری

تو تھی۔ ان کا بارود ختم ہو چکا تھا اور صدیق علی انھیں یہ حکم دے چکا تھا کہ اب توپوں سے کام نہ لیا جائے۔ اب اگر دشمن نے دوبارہ حملہ کیا تو بندوقیں، نیزے اور تلواریں ہمارا آخری سہارا ہوں گی۔

تیسرے پہر دشمن کی پیادہ فوج اپنے توپخانوں کی گولہ باری کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے سرک کر نئے مورچے تیار کر رہی تھی۔ صدیق علی فصیل کے ایک مورچے میں بیٹھا دشمن پر گولیاں برسا رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فائر کرنے کے بعد اپنی بندوق بھرنے لگا تو کسی نے اسے اپنی بندوق پیش کرتے ہوئے کہا "یہ لیجیے! یہ بھری ہوئی ہے۔ خالی بندوق مجھے دے دیجیے! میں بارود اور گولی ڈالنا جانتی ہوں۔"

یہ رضیہ تھی۔ صدیق علی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے بندوق لے لی اور وہ اس کے قریب بیٹھ کر خالی بندوق بھرنے لگی۔ صدیق علی نے نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔ "رضیہ! ہماری منزل شاید اب بہت قریب آچکی ہے۔ ہزاروں باتیں ایسی ہیں جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمھارے پاس بیٹھ کر مسعود کے متعلق باتیں کروں اور تمھیں یہ بتاؤں کہ اس کا بچپن اور جوانی کیسی تھی۔ وہ مجھے کس قدر عزیز تھا۔ اس کی شہادت سے تھوڑی دیر قبل میں یہ تصور کر رہا تھا کہ ہم سرنگا پٹم پہنچ چکے ہیں — ہم دریائے کاویری کے کنارے سیر کر رہے ہیں — میں اپنے ابا جان اور امی جان کو تمھارے متعلق بتا رہا ہوں اور میرے چھوٹے بھائی تمھیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔"

رضیہ بولی۔ "اور میں شاید اس وقت آپ کے ساتھ کسی جہاز پر سفر کر رہی تھی — ہم کسی ایسے جزیرے کی طرف جا رہے تھے جہاں انسانیت جنگوں کے آلام و مصائب سے آزاد ہے۔ جہاں ملت فروش اپنے وطن کی آزادی اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتے۔"

صدیق علی نے فائر کرنے کے بعد رضیہ کے ہاتھ سے بھری ہوئی بندوق لیتے ہوئے

کہا۔ "رضیہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں ایک کامیاب جہاز راں بنوں اور منگلور سے روانہ ہوتے وقت یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ مجھے اچانک برّی فوج کا ایک افسر بنا دیا جائے گا۔ جب تم جہاز پر سوار ہوتی تھیں تو اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنانے کے لیے اننت پور کا قلعہ منتخب کیا ہے۔"

رضیہ نے کہا۔ "میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ کسی مرحلہ پر مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کا حکم نہیں دیں گے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر چند گھنٹوں تک ہمیں کوئی کمک نہ پہنچی تو بچوں اور عورتوں کی خاطر ہم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر دشمن انھیں یہاں سے نکلنے کا موقع دینے پر رضامند ہو گیا تو میں اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ ان کی قید میں جانا قبول کر لوں گا، اگرچہ ان کی قید ہمارے لیے موت سے بدتر ہوگی۔ بہرحال ان حالات میں اس قلعے کے کماندار کی حیثیت میں میرا جو حکم باقی عورتوں اور بچوں کے لیے ہوگا وہی تمھارے لیے ہوگا۔"

رضیہ نے پُر امید ہو کر کہا۔ "ایسا وقت آنے پر میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میں ایسا وقت نہیں آئے گا۔"

شام کے وقت قلعے کے باقی افسر صدیق علی سے یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا بارود اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اگر تھوڑی دیر تک کوئی کمک نہ آئی تو ممکن ہے کہ رات کے وقت دشمن کسی مزاحمت کے بغیر قلعے میں داخل ہو جائے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "اب ہمارا مقصد لڑائی میں دشمن کو زیادہ سے زیادہ دیر یہاں مصروف رکھنا ہے۔ ہمیں یہ رات گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

رات کے وقت قلعے کی توپوں کو خاموش دیکھ کر انگریز اپنی توپیں اور قریب

لا چکے تھے اور ان کی گولہ باری کے اثرات پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن تھے۔ جس مورچے میں صدیق علی بیٹھا ہوا تھا اس کے اردگرد فصیل کا کچھ حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اس نے رضیہ کو بڑے اصرار کے بعد نیچے جانے پر رضامند کیا۔ وہ عورتوں کے ایک کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد اس پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔

رات بھر کی گولہ باری کے بعد صبح کی روشنی میں اننت پور کا قلعہ ویرانی اور بربادی کا ایک دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ قلعے کے محافظ اپنی آخری گولی چلا چکے تھے۔ صدیق علی نے حسرت ویاس کے عالم میں چاروں طرف دیکھا اور ایک سپاہی کو فصیل سے سفید جھنڈا لہرانے کا حکم دیا۔ دشمن کی توپیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ صدیق علی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور قلعے سے کوئی پچاس گز دور جا کر رک گیا۔ دشمن کی صفوں سے سواروں کا ایک دستہ نکلا اور آن کی آن میں صدیق علی کے قریب آ رکا۔ صدیق علی نے کہا۔ "میں آپ کے کمانڈر کے پاس یہ پیش کش لے کر آیا ہوں کہ اگر آپ اس قلعے میں پناہ لینے والی عورتوں اور بچوں کو نکل جانے کا موقع دیں تو ہم یہ قلعہ آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

ایک انگریز افسر نے جواب دیا۔ "تمھیں یہ درخواست لے کر کمانڈر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کمانڈر ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جنھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمارے صلح کے جھنڈے پر فائرنگ کی تھی۔ اگر تم غیر مشروط پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہو تو گولہ باری پھر دوبارہ شروع کر دی جائے گی اور قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد ہم تمھیں بدترین سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "جس شخص نے اس قلعے کے متعلق آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا، وہ میسور کا غدار تھا۔"

افسر نے کہا۔ "ہم تمھارے ساتھ بحث میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ تم واپس جا سکتے ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم تمھاری مزاحمت کے باوجود ایک گھنٹے کے اندر اندر اس قلعے پر قبضہ کر لیں گے۔"

صدیق علی نے مایوس ہو کر کہا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو آپ عورتوں اور بچوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

افسر نے جواب دیا۔ "تمھارے ہتھیار نہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمھارا بارود ختم ہو چکا ہے اور تم نے اس وقت صلح کا جھنڈا بلند کیا ہے جب تمھارے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا۔ تم ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ زیادتی کرنا ہماری شان کے شایان نہیں لیکن ہم ان کے متعلق تمھارے ساتھ کوئی بات کرنے پر آمادہ نہیں۔ تم جا سکتے ہو۔"

صدیق علی نے مڑ کر قلعے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی کمر سے تلوار اتار کر انگریز افسر کو پیش کر دی۔

تھوڑی دیر بعد انگریزی فوج فتح کے نقارے بجاتی قلعے کے اندر داخل ہوئی۔ انگریز کمانڈنٹ کے حکم سے قلعے کے محافظوں کو جن میں سے بیشتر زخمی تھے، غیر مسلح کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ چند سپاہی ان کے سامنے بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے اور باقی بھوکے بھیڑیوں کی طرح عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی کسی کا زیور اتار رہا تھا اور کوئی کسی کا لباس نوچ رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخوں کیساتھ انگریزوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

صدیق علی یہ جگر خراش منظر برداشت نہ کر سکا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھا اور اپنے راستے کے ایک سپاہی کو دھکا دے کر گرانے کے بعد آنکھ جھپکنے کی دیر میں ایک انگریز افسر پر پل پڑا جو ایک نوجوان لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس نے ایک ہی

مکے سے اسے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسے گلا دبوچ لیا۔ سپاہیوں نے بندوقوں کے کندے مار مار کر اسے علٰحدہ کیا اور اس کے ہاتھ ایک رسّی سے جکڑ دیئے۔ اتنی دیر میں صدیق علی کے چند ساتھی [illegible] سپاہیوں کے ہاتھوں سے سنگینیں چھین کر چھ آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔ انگریزوں نے اس کے جواب میں قتل عام شروع کر دیا اور آن کی آن میں پچاس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اس وحشیانہ قتل عام کے دوران میں کئی عورتیں اور لڑکیاں دشمن کی وحشت اور بربریت سے بچنے کے لیے قلعے کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر جانیں دے چکی تھیں۔

انگریز کمانڈنٹ نے صورتِ حالات پر قابو پاتے ہی بقیۃ السیف قیدیوں میں سے بیس آدمی علٰحدہ کیے اور ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر فصیل کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ صدیق علی ان کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ دیوار سے چند قدم دور قیدیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رضیہ چند عورتوں کے ساتھ پشت بہ دیوار قیدیوں سے تھوڑی دور کھڑی سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ انگریز کمانڈنٹ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔

رضیہ اچانک عورتوں کے ہجوم سے نکل کر بھاگی اور "صدیق صدیق" کہتی ہوئی بندوقوں کی زد میں آگئی۔ اس کے ساتھ کمانڈنٹ نے "فائر" کہہ کر ہاتھ نیچے کر دیا۔ بندوقوں کے مہیب دھماکوں کے ساتھ —— ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ رضیہ، صدیق علی سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر گری —— اٹھی —— پھر گری —— اور اس کے بعد زمین پر رینگتی ہوئی صدیق علی کی لاش سے لپٹ گئی۔

ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مر چکی ہے"

تھوڑی دیر بعد انگریز سپاہی قیدیوں کی ایک اور ٹولی پر اپنی بندوقوں کا

نشانہ آزما رہے تھے اور پھر جب فاتح لشکر اننت پور کے قلعے پر اپنے پرچم کو سلامی دے رہا تھا تو چند زخمیوں اور بیماروں کے سوا جنہیں انتہائی بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا، قلعے کے باقی محافظ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکے تھے۔ وہ عورتیں جو بچ گئی تھیں۔ ان میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کے چہروں پر زخموں کے نشان نہ تھے ❊

اکیسواں باب

معظّم علی، ایاز خاں کی غدّاری اور بدنور پر انگریزوں کے اچانک قبضے کی خبر سن چکا تھا۔ لیکن وہ صدیق اور مسعود کے انجام سے کئی دن بے خبر رہا۔ ایک صبح فرحت حسبِ معمول نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کر رہی تھی اور معظّم علی مراد کے ساتھ فوجی درسگاہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ صابر نے اندر آ کر کہا۔ "ایک فوجی افسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ملیبار سے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے اسے دیوان خانے میں بٹھا دیا ہے۔"

معظّم علی نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دیوان خانے کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد وہ میسور کی فوج کے ایک بڑے افسر کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا۔ معظّم علی نے کہا۔ "تشریف رکھیے۔ آپ ملیبار سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں! میرا نام لطف علی بیگ ہے۔"

معظّم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا نام سن چکا ہوں، فرمائیے!"

لطف علی نے کہا۔ "مجھے سلطانِ معظّم نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔"

معظّم علی نے لطف علی کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "آپ صدیق، مسعود یا انور میں سے کسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"جی میں صدیق اور مسعود کے متعلق بہت بری خبر لے کر آیا ہوں۔"

چند ثانیے معظّم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر میرے بیٹوں نے کسی میدان میں پیٹھ نہیں دکھائی تو میرے لیے ان کے متعلق کوئی خبر بُری نہیں ہو سکتی۔ بتائیے آپ کیا خبر لائے ہیں؟"

لطف علی نے کہا۔ "آپ اننت پور میں انگریزوں کے مظالم کے واقعات سن چکے ہیں؟"

"ہاں"

"صدیق علی خاں اننت پور کے قلعے کا محافظ تھا اور مسعود علی اس کے ساتھ تھا۔"

"اور وہ دونوں ....؟"

"وہ دونوں شہید ہو چکے ہیں۔"

معظّم علی سکتے کے عالم میں چند ثانیے لطف علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "لیکن صدیق علی تو بحری فوج میں تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اننت پور کیسے پہنچا؟"

لطف علی نے جواب دیا۔ "وہ منگلور سے سامان جنگ لے کر کنڈاپور گیا تھا۔ وہاں ایاز خاں کی غدّاری کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اسے کنڈاپور کی فوج کی کمان سنبھالنی پڑی۔ اس کے بعد بدنور کے علاقے میں ہماری رہی سہی افواج اس کے گرد جمع ہو چکی تھیں۔ مسعود علی پہلے سے وہاں تھا۔ وہ انگریزوں کے حملے سے چند دن پہلے اسد خاں کی کمان میں کنڈاپور پہنچ چکا تھا۔ اسد خاں کنڈاپور کی جنگ میں شہید ہوا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی ذمہ داریاں صدیق علی کو سونپ دی تھیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسد خاں آپ کا دوست تھا؟"

"جی ہاں وہ میرا بہترین دوست تھا۔"

"سلطانِ معظّم کو صدیق علی اور مسعود کی شہادت کی خبر سن کر بہت صدمہ ہوا تھا اور انھوں نے مجھے آپ کے نام ایک ذاتی خط دے کر بھیجا ہے۔" لطف علی نے ایک خط نکالا اور معظّم علی کو پیش کر دیا۔

معظّم علی نے خط کھول کر پڑھا۔ سلطان ٹیپو نے لکھا تھا:

"میرے عزیز دوست! میں لطف علی کو ایک المناک خبر سنانے کے لیے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ کاش میرے الفاظ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میری سلطنت کے تمام خزانے صدیق علی اور مسعود جیسے جانبازوں کے خون کے ایک قطرے کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ آپ نے کچھ عرصہ قبل جنگ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی اور میں نے آپ کی درخواست کا اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مجھے محاذِ جنگ کی بجائے سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ میں آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ میری اب بھی یہی رائے ہے کہ آپ سرنگا پٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو آپ جس وقت چاہیں سرنگا پٹم میں کسی موزوں آدمی کو اپنی ذمہ داریاں سونپ کر تشریف لے آئیں۔ مجھے جنگ میں بھی آپ جیسے لوگوں کے مشوروں کی ضرورت ہے۔"

خط پڑھنے کے بعد معظمؒ علی دیر تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے لطف علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ ان کی شہادت کے متعلق اچھی طرح تصدیق کر چکے ہیں؟"

"جی ہاں! اننت پور کے وحشیانہ قتلِ عام کے بعد انگریزوں نے چند عورتیں اور بچے جن میں سے اکثر زخمی تھے، ہمارے حوالے کر دیئے تھے اور انھوں نے آپ کے بیٹوں کی شہادت کی خبر کی تصدیق کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اننت پور کے واقعات لوگوں کے سامنے آئیں گے تو میسور کا ہر باشندہ ان کی جرأت، ہمت اور غیرت پر فخر کرے گا۔"

معظمؒ علی نے کہا۔ "کاش ان کی قربانی اس قوم کی تقدیر بدل سکتی جس کی عزت اور آزادی چند غداروں اور ابن الوقتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ کاش میسور میں کوئی اور ایاز پیدا نہ ہو۔"

لطف علی نے کہا۔ "مجھے اب اجازت دیجیے۔ میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔

اگر آپ سلطانِ معظمؒ کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں تو میں پہنچا دوں گا۔"

"آپ میری طرف سے سلطانِ معظمؒ کا شکریہ ادا کیجیے اور ان سے کہیے کہ میں بہت جلد ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

◆

ایک ہفتہ بعد رات کے پچھلے پہر معظمؒ علی اور فرحت مکان کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظمؒ علی سفر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مراد آنکھیں ملتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "ابّاجان آپ تیار ہو گئے ہیں، ابھی تو بہت رات باقی ہے؟"

"نہیں بیٹا وہ دیکھو صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا ہے۔"

مراد علی نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر شکایت کے لہجے میں کہا۔ "امّی جان آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جب ابّاجان اٹھیں گے آپ مجھے جگا دیں گی۔"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹا میں نے تو یہ وعدہ کیا تھا کہ تمھارے ابّاجان تم سے مل کر جائیں گے۔"

معظمؒ علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تم وعدہ کرو کہ میری غیر حاضری میں اپنا وقت ضائع نہیں کرو گے۔ صدیق اور مسعود ایک بہت بڑے مقصد پر قربان ہوئے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میسور کو بہترین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں تمھیں میسور کا بہترین نوجوان دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مراد علی نے پوچھا۔ "ابّاجان آپ کب تک واپس آئیں گے؟"

"بیٹا میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر انور علی ملیبار پہنچ چکا ہے تو اسے چند دن کے لیے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" اس کے بعد معظمؒ علی فرحت کی طرف متوجہ ہوا۔ "فرحت تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں انشاءاللہ جلد واپس آ جاؤں گا۔"

فرحت نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "میں پریشان نہیں ہوں۔ میں یہ سوچ رہی تھی

کہ گذشتہ تیس برس میں ہمارے خاندانوں کی تین نسلیں یکے بعد دیگرے قوم کے غدّاروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی چلی آرہی ہیں۔ خدا معلوم اس ملک میں میر جعفر کی روح کب تک زندہ رہے گی اور یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا۔"

معظّم علی نے جواب دیا۔ "فرحت یہ دنیا خیر و شر کی رزمگاہ ہے مجھے یقین ہے، کہ ابن الوقتوں، غدّاروں اور ملت فروشوں کا یومِ حساب اب قریب آچکا ہے۔ بدنور کے واقعات نے سلطان ٹیپو کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے سامنے پہلا مسئلہ قوم کو ان گندے عناصر کے وجود سے پاک کرنا ہوگا۔ انگریزوں سے نپٹنے کے بعد میں سلطان سے یہ مطالبہ کروں گا کہ بدنور کے غدّاروں کا معاملہ میرے سپرد کردیا جائے فرحت! جو قوم سلطان ٹیپو کو جنم دے سکتی ہے۔ اس کے لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، میں بہت جلد واپس آکر تمھیں یہ مژدہ سناؤں گا کہ صدیق اور مسعود کا خون رائگاں نہیں گیا اور اننت پور اور بدنور پر ہماری فتح کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ معظّم علی چند ثانیے خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر "خدا حافظ" کہہ کر چل دیا۔ جب وہ صحن سے باہر نکل گیا تو فرحت مراد علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے مردانہ حصّے کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند قدم آگے معظّم علی گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا اور نوکر اس کے گرد جمع تھے۔ معظّم علی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور فرحت کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے

مراد علی کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "چلیے امّی جان!"

ماں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "چلو بیٹا اب مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت ہے۔"

○

میسور کی افواج انگریزوں سے ساحلی چوکیاں چھیننے کے بعد حیدر گڑھ اور بدنور کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کر چکی تھیں اور بدنور میں جنرل میتھیوز کی فوج سمندر کی طرف سے رسد و کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کے باعث محاصرے کی سی حالت کا سامنا کر رہی تھی۔ سلطان ٹیپو حیدر گڑھ اور بدنور کے درمیان ایک وادی میں پڑاؤ ڈالے مختلف محاذوں پر لڑنے والی افواج کی نگرانی کر رہا تھا۔

وہ جنگ کے ایام میں بھی سلطنت کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا۔ وزیر، صوبیدار اور دوسرے عہدیدار اسے باقاعدگی کے ساتھ اپنی کارگزاریوں کی تفصیلات لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ سلطان ہر روز اپنے عُمّال کے بیشمار خطوط، اور رعایا کی درخواستوں کے جواب اور اہم مقدمات کے فیصلے لکھواتا۔ ملاقاتیوں سے ملتا اور اس کے بعد فوجی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دن گیارہ بجے کے قریب سلطان اپنے دفتری کاموں سے فارغ ہوا تو اس کے سامنے حسبِ معمول ملاقاتیوں کی فہرست پیش کی گئی۔ سلطان نے کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہی پوچھا: "معظّم علی کب آئے ہیں؟"

فہرست پیش کرنے والے افسر نے جواب دیا: "عالیجاہ! وہ کل رات یہاں پہنچے تھے۔"

سلطان ٹیپو نے کہا۔ "انھیں لے آؤ۔"

افسر باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظّم علی اندر داخل ہوا۔ سلطان نے مسند سے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا: "مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہم اننت پور کے جانبازوں کو بروقت کمک نہ بھیج سکے۔ دشمن نے اچانک منگلور پر حملہ کر کے ہماری افواج کو اس محاذ سے توجہ ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اب ان ظالموں کا یومِ حساب شروع ہو چکا ہے۔ ہم نے سمندر کی طرف سے دشمن کے رسد و کمک کے راستے منقطع کر دیئے ہیں۔ حیدر گڑھ فتح ہو چکا ہے اور کل وہاں سے ہماری فوج کا ایک حصّہ اننت پور روانہ ہو جائے گا اور اس کے بعد چند دن تک بدنور کا قلعہ بھی ہماری

توپوں کی زد میں ہوگا۔ میرے الفاظ اس باپ کے زخموں کے لیے مرہم کا کام نہیں دے سکتے جو صدیق علی اور مسعود علی جیسے ہونہار بیٹوں سے محروم ہو چکا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ انت پور کے شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی

معظم علی نے کہا۔ "ایک باپ کے لیے اس سے زیادہ حوصلہ افزا خبر کیا ہو سکتی ہے، کہ اس کے بیٹے آپ کی نگاہوں میں عزت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔"

سلطان نے کہا: "آپ جنگ میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو انت پور پر حملہ کرنے والی فوج کی کمان سونپنے کے لیے تیار ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میں شکریے کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔"

سلطان ٹیپو نے کہا۔ "جب آپ اس مہم سے واپس آئیں گے تو میں آپ کو اس سے زیادہ اہم ذمہ داری سونپنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے بدنور کی صوبیداری کے لیے آپ سے زیادہ موزوں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ آپ حیدر گڑھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ شام سے پہلے وہاں کے سپہ سالار کے نام آپ کی تقرری کے احکام پہنچ جائیں گے۔"

معظم علی نے احسان مندی کے ساتھ شیر میسور کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔

غروب آفتاب سے تھوڑی دیر قبل معظم علی گھوڑا دوڑاتا ہوا حیدر گڑھ کے قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ گھوڑے سے اترتے وقت معظم علی کی نگاہیں ایک نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ اس کا تیسرا بیٹا انور علی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے کہا: "انور تم کب سے یہاں ہو؟" انور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے جواب دیا: "اباجان ہماری لے

پہنچتے یہاں پہنچ گئی تھی۔ مجھے ابھی سپہ سالار نے یہ بتایا تھا کہ آپ یہاں تشریف لا رہے ہیں امی جان اور مراد کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہیں بیٹا۔ تمھارے سپہ سالار کہاں ہیں؟"

"وہ اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلیے!"

معظم علی، انور علی کے ساتھ قلعے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میسور کی فوج کا مایۂ ناز جرنیل غازی خاں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور اس کے سامنے کئی نقشے اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ غازی خاں نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا "مجھے آپ کے متعلق حکم موصول ہو چکا ہے۔ آپ کی فوج علی الصباح کوچ کرنے کے لیے تیار ہے۔"

○

انت پور کے قلعے پر دو دن سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ انگریز قلعے سے باہر اپنی رسد اور کمک کے راستے مسدود پا کر مایوس ہو چکے تھے۔ تیسرے دن معظم علی کی فوج قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ قلعے کے ایک شکستہ برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔ معظم علی نے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا اور فضا میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ فوج کا ایک نوجوان افسر گھوڑا بھگاتا ہوا معظم علی کے قریب پہنچا اور اس نے کہا "جناب اس قلعے کی فوج کو امان دینا گناہ ہے ان لوگوں کے ہاتھ ہمارے بے گناہ بھائیوں اور بہنوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جنگی قیدیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ہم انھیں معاف نہیں کر سکتے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ہم برائی میں اپنے دشمنوں کی تقلید نہیں کریں گے۔ صلح اور جنگ کے متعلق ہمارا اپنا ایک ضابطہ ہے۔"

"لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بیٹوں کے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے لیکن اپنے بیٹوں کی مظلومیت مجھے بھیڑیوں کی تقلید کرنے کی

قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک انگریز افسر جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معظم علی سے کہہ رہا تھا "ہمارے کماندار متارکۂ جنگ کے لیے آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

ظم علی نے جواب دیا۔ "انھیں ہمارے ساتھ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ان سے کہو کہ جنگ ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہتھیار ڈال دیں!"

انگریز افسر نے کہا۔ "اگر آپ ہمیں اپنی حفاظت میں سداشیوگڑھ پہنچانے کا ذمہ لیں تو ہم یہ قلعہ خالی کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

معظم علی نے تلخ ہو کر جواب دیا۔ "تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جنگ بند کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔"

انگریز افسر نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ "اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جنگی قیدیوں کا سا سلوک کریں گے؟"

"ہم تمھیں کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تمھارے جرائم ایسے ہیں کہ تمھارے ساتھ بات کرنا بھی انسانیت کی توہین ہے لیکن تم اپنے کماندار کو میری طرف سے یہ بتا سکتے ہو کہ ہم تمھارے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو تم نے اننت پور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد ہمارے سپاہیوں اور ہماری عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ میں تمھیں فیصلہ کرنے کے لیے نصف گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد قلعے پر گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔ تم جا سکتے ہو۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "اگر آدھ گھنٹے کے بعد قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے آپ کا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں یہ کافی نہیں۔ آپ کو تمام فوج قلعے سے باہر کھڑی کرنی پڑے گی اور ان کے ہتھیار ایک جگہ ڈھیر کرنے ہوں گے۔ پھر جب ہم قلعے پر قبضہ کر لیں گے تو آپ کو کسی موزوں جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔"

انگریز افسر نے معظم علی کو فوجی سلام کرنے کے بعد گھوڑے کی باگ موڑلی۔ کوئی بیس منٹ بعد قلعے کا دروازہ کھل چکا تھا اور انگریز باہر نکل کر فصیل سے چند گز آگے اپنا اسلحہ ڈھیر کر رہے تھے۔

معظم علی نے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز عورتوں کو چند کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ قلعے کے اندر میسور کی فوج کے وہ قیدی جو انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے تھے، ہڈیوں کے ڈھانچے معلوم ہوتے تھے اور چلا چلا کر صدیق علی اور اس کے ساتھیوں کے انتقام کا مطالبہ کر رہے تھے۔

معظم علی نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں صدیق اور مسعود کا باپ ہوں۔ جب معظم علی نے شہداء کی قبروں کے متعلق پوچھا تو ایک قیدی نے بتایا کہ ان سب کو قلعے سے باہر ایک ہی گڑھے میں دفن کر دیا گیا تھا اور وہ گڑھا ہم سے کھدوایا گیا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد فاتح لشکر قلعے سے باہر مٹی کے ایک انبار کے گرد کھڑا تھا اور اس انبار کے اوپر میسور کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ معظم علی قیدیوں کی زبانی اس لڑکی کے متعلق سن رہا تھا۔ جس نے صدیق علی کے ساتھ جام شہادت نوش کیا تھا۔ کسی کو اس کی پوری داستان معلوم نہ تھی۔ اپنے ان گنت سوالات کے جواب میں وہ صرف یہ معلوم کر سکا کہ اس کا بیٹا کسی عالی نسب اور بے یار و مددگار لڑکی کا آخری سہارا تھا اور اس نے اسے شیموگہ کے قلعے سے اپنے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور صدیق اور مسعود کے بچپن اور جوانی کی بے شمار تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ پھر اپنے بیٹوں کے ساتھ وہ ایک لڑکی کی مختلف خیالی تصویریں دیکھنے لگا — "میری بیٹی!" وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے معلوم نہیں تو کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی، کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ میں

مھیں کبھی نہیں دیکھوں گا لیکن اگر تمھاری روح میری آواز سن سکتی ہے تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے بچوں سے کم عزیز نہیں ہو۔"

* * *

اگلے دن معظم علی نے چار سو سپاہی قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باقی دستوں کے ساتھ سلطان کے پڑاؤ کا رخ کیا۔ راستے میں اسے یہ اطلاع ملی کہ سلطان کا لشکر بدنور کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ معظم علی اپنی پیادہ فوج کو پیچھے چھوڑ کر سوار دستوں کے ہمراہ یلغار کرتا ہوا بدنور پہنچا تو وہاں لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

معظم علی نے شہر کی مشرقی دیوار سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر اپنے ساتھیوں کو رکنے کا حکم دیا اور خود گھوڑے سے اتر کر بھاگتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے آنکھوں سے دوربین لگا کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیلے سے اترا اور اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں سے اترنے کا حکم دے کر ایک افسر کی طرف متوجہ ہوا۔
"تم اپنے سپاہیوں سے کہو کہ وہ گھوڑوں کو پیچھے لے جائیں، میں باقی دستوں کے ساتھ آگے جا رہا ہوں۔"

چند منٹ بعد وہ شہر کی مشرقی سمت غازی خاں کی قیادت میں لڑنے والے سپاہیوں کی صف [illegible] شامل ہو گیا۔ سلطان کی فوج کا فرانسیسی توپخانہ فصیل کے مشرقی دروازے پر گولہ باری کر رہا تھا اور توپخانے کے دائیں بائیں غازی خاں کی فوج فیصلہ کن حملے کے لیے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ فرانسیسی توپخانے کی گولہ باری کے باعث مشرقی دیوار میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے شگاف پیدا ہو چکے تھے۔ تاہم انگریز فصیل کے مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور ان کی جوابی گولہ باری کافی شدید تھی۔ شہر کی مغربی سمت سے نقاروں کی صدائیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس طرف عام حملے کا حکم ہو چکا ہے۔
غازی خاں نے نقاروں کی صدائیں سنتے ہی اپنے دستوں کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ سپاہی

اپنے اپنے مورچوں سے نکلے اور رینگتے ہوئے شہر پناہ کی طرف بڑھنے لگے۔ پھر کئی نوجوان اچانک بانس کی سیڑھیاں اٹھا کر بھاگے اور آن کی آن میں فصیل کے قریب پہنچ گئے لیکن دشمن کی شدید مزاحمت کے باعث وہ فصیل کے کسی حصے پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے اور انھیں مشرقی دروازے کے آس پاس چند لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

معظم علی فصیل سے کوئی تیس چالیس قدم دور ایک زخمی سپاہی کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دو فرانسیسی جوان جن میں سے ایک کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی اور دوسرا اپنے بازوؤں میں ایک بارودی گولہ تھامے ہوئے تھا۔ بے تحاشا فصیل کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ فصیل کے مورچوں پر گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ معظم علی بلند آواز میں چلایا۔ "دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھو۔" اور اس کے ساتھیوں نے پلٹ کر فصیل پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ غازی خاں اور فوج کے دوسرے افسر دم بخود ہو کر فرانسیسی جانبازوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بارودی گولے کے بوجھ کے باعث فرانسیسی سپاہی اپنی دوڑ کا آخری مرحلہ بڑی مشکل سے طے کر رہا تھا اور دوسرا جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، چند قدم بھاگ کر اپنے ساتھی سے آگے نکل جاتا اور پھر اچانک زمین پر لیٹ کر اس کا انتظار کرتا۔ فصیل سے آٹھ دس قدم دور یہ دونوں یکے بعد دیگرے زخمی ہو کر گر پڑے۔ ایک ثانیہ بعد ان میں سے ایک دوبارہ اٹھا اور گولہ اٹھا کر فصیل کے ساتھ جا گرا۔ پھر اس نے گولے کو فصیل کے شگاف کے اندر دھکیل دیا اور زمین پر رینگتا ہوا واپس مڑا۔ اپنے گرے ہوئے ساتھی کے قریب پہنچ کر اس نے جلتی ہوئی مشعل اٹھائی اور دوبارہ مڑ کر فصیل کی طرف رینگنے لگا لیکن اچانک اس کے سر پر گولی لگی اور وہ بے حس و حرکت لیٹ گیا۔

معظم علی اچانک اٹھ کر پوری رفتار سے بھاگا اور پھر اچانک زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ پھر چند قدم اٹھا کر بھاگا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ تیسری کوشش میں وہ فرانسیسی

سپاہی کے ہاتھ سے گری ہوئی مشعل اٹھا چکا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کی ران اور اس کے سینے میں دو گولیاں لگیں لیکن وہ گرتے پڑتے بارودی گولے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فصیل کے شگاف کے اندر سمٹنے کے بعد وہ اوپر سے آنے والی گولیوں کی زد سے محفوظ تھا۔ اس نے جلتی ہوئی مشعل بارودی گولے کے فیتے پر رکھ دی پھر اپنی رہی سہی قوت بروئے کار لاتے ہوئے فصیل کے شگاف سے باہر نکلا اور بھاگنے لگا۔

اتنی دیر میں فصیل کے مورچوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ فصیل سے بیس گز دور معظم علی گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔ دھوئیں اور گرد کے بادل اڑے اور میسور کے سپاہی قلعے کی مشرقی دیوار میں ایک چھوٹے شگاف کی جگہ ایک بڑی گزرگاہ دیکھ رہے تھے :-

○

معظم علی نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک خیمے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ انور علی اور میسور کی فوج کا ایک بہترین طبیب اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ طبیب نے جلدی سے اسے سہارا دے کر لٹاتے ہوئے کہا۔ "آپ آرام سے لیٹے رہیں!"

معظم علی نے چند ثانیے سستانے کے بعد انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں کہاں ہوں بڈنور فتح ہوا یا نہیں؟"

"ابا جان! بڈنور کا شہر فتح ہو چکا ہے۔ اب صرف قلعہ باقی ہے"

معظم علی نے کہا۔ "بیٹا! تمھیں میری خاطر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہونا چاہیے"

"ابا جان مجھے سلطان معظم اور غازی خاں نے آپ کے پاس ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ابھی آپ کو دیکھ کر گئے ہیں۔ برہان الدین بھی آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ ابھی قلعے پر حملہ شروع نہیں ہوا۔ اس کے گرد ابھی توپیں نصب کی جا رہی ہیں"

معظم علی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "بیٹا شہر کی لڑائی میں ہمارا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟"

"نہیں ابا جان! شہر کی فصیل ٹوٹنے کے بعد انگریز چاروں اطراف سے بھیڑوں کی طرح قلعے کی طرف دوڑ رہے تھے"

طبیب نے دوا کی پیالی معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "باتیں کرنے سے آپ کی تکلیف میں اضافہ ہوگا۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ یہ دوا پی لیجیے!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر یہ دوا مجھے بیہوش کرنے کے لیے ہے تو میں نہیں پیوں گا۔ میں اپنی زندگی کی باقی گھڑیوں میں سے ایک لمحہ کے لیے بھی بیہوش رہنا پسند نہیں کروں گا اور آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ میں صرف چند گھڑی کا مہمان ہوں"

انور علی نے کہا۔ "ابا جان! غازی خاں کہتے تھے کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو امی جان اور مراد علی کو یہاں لانے کا انتظام ہو سکتا ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں بیٹا! تم جاؤ اور کہیں سے کاغذ اور قلم لے آؤ۔ میں ان کے نام ایک خط لکھنا چاہتا ہوں"

انور علی اٹھ کر باہر نکل گیا اور طبیب نے کہا۔ "دیکھیے آپ اس حالت میں خط نہیں لکھ سکتے"

"آپ کو مجھے اپنی زندگی کا آخری فرض ادا کرنے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ میں خود لکھنے کی بجائے انور علی یا آپ میں سے کسی کو چند سطریں لکھوا دوں گا"

طبیب نے کہا۔ "میں آپ کو کسی بات سے منع نہیں کر سکتا لیکن آپ کم از کم دل کی تقویت کے لیے یہ دوا ضرور پی لیں"

معظم علی نے جواب دیا۔ "فتح کی خبر سے زیادہ میرے دل کے لیے اور کونسی چیز تقویت کا باعث ہو سکتی ہے۔ بہرحال میں دوا پی لیتا ہوں"

طبیب نے ایک بوتل سے چند گھونٹ دوا نکال کر پیالی میں ڈالی اور معظم علی کو پلا دی۔

انور علی قلمدان اور کاغذ اٹھائے خیمے میں داخل ہوا اور اپنے باپ کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔ طبیب نے معظم علی سے کہا۔ "آپ اطمینان سے خط لکھوائیں۔ میں باہر انتظار کرتا ہوں۔" پھر وہ انور علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "اگر ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے دینا۔"

طبیب باہر نکل گیا اور معظم علی فرحت کے نام خط لکھوانے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ طویل خط ختم ہو چکا تھا تو معظم علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔

"بیٹا! یہ خط اپنی ماں کو دے دینا۔ میں تمھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میرے بعد تم پر اپنی والدہ، اپنے بھائی اور سب سے زیادہ اپنے ملک و قوم کے متعلق کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک سعادت مند بیٹے اور ایک شفیق بھائی ثابت ہو گے لیکن میری امیدیں اور آرزوئیں اس سے بہت زیادہ ہیں۔ تمھارے لیے اور تمھارے بھائیوں کے لیے میری دعائیں ہمیشہ یہ رہی ہیں کہ تم قوم کی عزت اور آزادی کے امین بنو اور تمھاری آئندہ نسلیں اس درخت کی شاخوں پر جھولے ڈالیں جسے تمھارے اسلاف کے خون نے آبیار کیا ہے۔ میسور ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار ہے۔ سلطان ٹیپو کی فتح ان کروڑوں انسانوں کی فتح ہو گی جو اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تمھارے متعلق میری آخری خواہش یہ ہے کہ جب میسور کی عزت اور آزادی کے محافظ فتح و نصرت کے پرچم لہرائیں تو تم فخر کے ساتھ سر اونچا کر کے یہ کہہ سکو کہ میسور کی خاک پر میرے باپ اور میرے بھائیوں کا خون گرا تھا۔ تم کسی دن میری قبر پر آؤ اور مجھے یہ مژدہ سناؤ کہ اباجان آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں وہ پورا ہو چکا ہے۔ آزادی کے جس سورج کی تلاش میں آپ مرشد آباد سے نکلے تھے وہ میسور میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے

بیٹا! تمھاری منزل بہت دور اور تمھارا راستہ بہت کٹھن ہے لیکن قدرت نے تمھیں ایک ایسا رہنما عطا کیا ہے جو عزم و ثبات اور ایثار و خلوص کی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ ایک قافلے کی اس سے زیادہ اور کیا خوش بختی ہو سکتی ہے کہ اس کا رہنما مہیب تاریکیوں، آندھیوں اور طوفانوں میں اپنی منزل دیکھ سکتا ہو۔"

انور علی بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اباجان مجھے یقین ہے کہ آپ تندرست ہو جائیں گے۔ سلطان کو آپ جیسے ساتھیوں کی ضرورت ہے اور میسور میں ابھی آپ کے حصے کا بہت سا کام باقی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "بیٹا! شاہراہِ زندگی کے ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میں اپنی زندگی کے آخری سانس کے لیے اس سے بہتر مقام کی تمنا نہیں کر سکتا تھا۔ تمھاری عمر میں میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ میں حق کے لیے زندہ رہوں، حق کے لیے لڑوں اور حق کے لیے جان دوں۔"

طبیب خیمے میں داخل ہوا اور اس نے معظم علی کے قریب بیٹھ کر اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے چند دوست آپ کو دیکھنے آ رہے ہیں لیکن میں آپ کو اب زیادہ دیر باتیں کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ اپنے زخموں میں زیادہ درد محسوس تو نہیں کرتے؟"

معظم علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں! باتیں کرتے وقت مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔"

غازی خاں، برہان الدین اور فوج کے تین اور بڑے افسر خیمے کے اندر داخل ہوئے۔ غازی خاں نے آگے بڑھ کر معظم علی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیسے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ قلعہ فتح ہو چکا ہے؟"

غازی خاں نے جواب دیا۔ "نہیں! قلعے کی فتح کی خبر سننے کے لیے آپ کو شاید

چند دن انتظار کرنا پڑے۔ اس وقت اہم مقامات پر توپیں نصب کی جا رہی ہیں اور شام تک گولہ باری شروع ہو جائے گی۔ سلطانِ معظم آپ کے متعلق بہت فکر مند ہیں اور انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ کے بچوں کو یہاں بلا لیا جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں! میں اس حالت میں انھیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

معظم علی سے چند منٹ اور باتیں کرنے کے بعد غازی خاں اور اس کے ساتھی خیمے سے باہر نکل گئے۔ برہان الدین نے خیمے سے باہر نکلتے وقت مڑ کر دیکھا اور طبیب کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ طبیب جلدی سے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ برہان الدین اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا اور بولا: "سلطانِ معظم کا حکم ہے کہ آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے نا؟"

طبیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "نہیں! ان کا اس وقت تک اطمینان سے باتیں کرنا بھی ایک معجزہ ہے۔ زخم بہت شدید ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی ہمت اچانک جواب دے جائے گی۔"

برہان الدین نے کہا: "ان کی جان بہت قیمتی ہے۔"

طبیب نے کہا: "آپ اطمینان رکھیں، میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

○

اگلی رات معظم علی کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی۔ وہ کبھی کبھی ہوش میں آ کر انور علی سے کوئی بات کرتا لیکن چند منٹ کے بعد اس کی طاقت جواب دے جاتی اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں آنکھیں بند کر لیتا۔ آدھی رات کے قریب اس نے انور علی سے کہا: "بیٹا! میرا خیال تھا کہ میں آخری سانس لینے سے پہلے سلطانِ معظم سے چند باتیں کر سکوں گا لیکن وہ بہت مصروف ہیں۔"

انور علی نے کہا: "ابا جان! اگر آپ چاہیں تو میں غازی خاں کی وساطت سے ان تک آپ کا پیغام پہنچا سکتا ہوں۔ سلطانِ معظم عشاء کی نماز کے بعد آپ کو دیکھنے آئے تھے لیکن اس وقت آپ بیہوش تھے۔"

معظم علی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا: "انھیں اس وقت تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور بیٹا تم بھی لیٹ جاؤ۔"

انور علی نے کہا: "ابا جان! طبیب کسی زخمی کو دیکھنے کے لیے گیا ہے جب وہ واپس آئے گا تو میں سو جاؤں گا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

رات کے پچھلے پہر طبیب اسے دوا پلا رہا تھا اور انور علی اس کے قریب بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیا "تم یہیں ٹھہرو" اور ایک ثانیہ بعد انسانی سطوت و جبروت کا ایک پیکرِ مجسم خیمے کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی نگاہیں سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ طبیب ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انور علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور جلدی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ معظم علی نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ سلطان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھوں کا سہارا دیا اور کہا: "آپ اطمینان سے لیٹے رہیں۔" پھر وہ بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

معظم علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "عالیجاہ! مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے۔ اگرچہ ایسی خواہش آپ کے ایک خادم کو زیب نہیں دیتی۔"

سلطان نے کہا: "آپ میرے دوست ہیں اور مجھے آپ کی دوستی پر فخر ہے۔"

معظم علی نے کہا: "آپ ان لوگوں سے خبردار رہیں جو قوم کی عزت اور آزادی

کو تجارت کا مال سمجھتے ہیں۔ ایک غدّار ہزاروں شہیدوں کی قربانی پر پانی پھیر سکتا ہے۔ خدا معلوم اس ملک میں ابھی کتنے ایاز ہیں۔ بدنور اور ملیبار کے باقی علاقوں سے دشمن کو نکالنے کے بعد آپ کسی غدّار کو زندہ نہ چھوڑیں!"

سلطان نے جواب دیا۔ "غدّار اپنا وار کرنے سے پہلے ہمارے سامنے نہیں آتے۔ انھیں ختم کرنے کے لیے ایک حکمران کی بصیرت سے زیادہ پوری قوم کے اجتماعی احساس کی بیداری کی ضرورت ہے۔ خطرناک ناسور اس جسم پر ظاہر ہوتے ہیں جس میں صالح خون کی جگہ فاسد مادہ جمع ہو چکا ہو۔ غدّار ہمیشہ اس قوم کی آغوش میں جنم لیتے ہیں جس کی قوتِ مدافعت کمزور ہو چکی ہو۔ میری پونجی وہ تہی دست قوم ہے جس کی غیرت اور حمیّت کے خزانے لٹ چکے ہیں۔ اس قوم میں زندگی کی نئی روح بیدار کرنے کے لیے مجھے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر خدا نے مجھے ان جنگوں سے فرصت دی تو شاید میں یہ کام بھی کر سکوں لیکن میری جنگ صرف انگریزوں کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ مرہٹے اور نظام بھی مجھے اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔"

معظم علی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ قدرت نے آپ کو جس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ ضرور پورا ہو گا۔"

سلطان نے طبیب کی طرف دیکھا اور وہ جلدی سے آگے بڑھ کر معظم علی کی نبض ٹٹولنے لگا۔ سلطان نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "معظم علی!"

معظم علی نے آنکھیں کھولیں اور سلطان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور کہا۔ "عالیجاہ! مجھے موت کے لیے اس گھڑی کا انتظار تھا۔ خدا آپ کو فتح دے" پھر محبت، اطاعت اور عقیدت سے لبریز نگاہیں سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

چند ثانیے بعد معظم علی نے ایک گہری اور لمبی سانس لی اور سلطان کے ہاتھ پر اپنی

گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ مرشد آباد کی تاریک رات کا مسافر میسور کی حسین صبح کے آفتاب کے سامنے دم توڑ چکا تھا۔ طبیب سلطان کا اشارہ پا کر آگے بڑھا۔ اس نے معظم علی کی نبض دیکھی اور سر ہلا دیا۔

سلطان "انا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اٹھا۔ انور علی بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ سلطان نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! ان کی زندگی قابلِ تقلید اور ان کی موت قابلِ رشک تھی۔"

○

چند دن بعد سہ پہر کے وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ فرحت اور مراد علی مکان کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک مراد علی چلّایا۔ "امّی جان! امّی جان!! بھائی جان آ گئے!" پھر وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا صحن کی طرف بڑھا اور انور علی سے لپٹ گیا۔ انور علی کا لباس پانی اور کیچڑ سے لت پت تھا وہ مراد علی کو اپنے ساتھ چمٹائے آگے بڑھا۔ فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھی اور برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہو گئی لیکن انور علی کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ انور علی نے برآمدے کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتے ہوئے مرجھائی ہوئی آواز میں سلام کیا اور پھر آگے بڑھ کر ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" ماں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم بہت پریشان نظر آتے ہو!"

چند لمحات کے لیے انور علی کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اچانک جھک کر مراد علی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "امّی جان! ابا جان شہید ہو چکے ہیں۔"

فرحت کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کی طرف

بڑھی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی خاموشی چیخوں سے زیادہ دردناک اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں آنسوؤں سے زیادہ کرب انگیز تھیں۔ انور علی آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کمر کے تھیلے سے معظم علی کا خط نکال کر ماں کو پیش کرتے ہوئے کہا "امی جان! زخمی ہونے کے بعد ابا جان نے آپ کے لیے یہ خط لکھوایا تھا۔"

زحت نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خط پکڑ لیا لیکن کھول کر پڑھنے کی بجائے اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ مراد علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "امی جان! آپ نے ابا جان کا خط نہیں پڑھا؟"

زحت کے ہونٹ کپکپائے اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ پھر اچانک اس نے مراد علی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

صابر "انور علی انور علی" کہتا ہوا صحن میں داخل ہوا لیکن برآمدے کے قریب پہنچ کر ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے بعد ٹھٹک کر رہ گیا۔ "کیا ہوا بی بی جی؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

زحت جواب دینے کی بجائے اٹھی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ مراد علی اٹھ کر آگے بڑھا اور صابر کے ساتھ چمٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ انور علی نے کہا "چچا صابر! ابا جان شہید ہو گئے ہیں۔"

صابر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زحت کمرے میں جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے شوہر کا خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ معظم علی نے لکھا تھا:-

"رفیقۂ حیات! میں زخموں سے نڈھال ہوں اور بستر پر لیٹا ہوا تمھیں یہ خط لکھوا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ قدرت کو میرا زندہ رہنا منظور

ہو اور میں تمھیں دوبارہ دیکھ سکوں لیکن اب مجھے زندہ رہنے کی خواہش بھی ایک خود فریبی معلوم ہوتی ہے۔ میرے زخم بہت شدید ہیں اور اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تمھارے نام یہ خط میرا آخری پیغام ہو۔

میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام تمھاری رفاقت اور تمھاری رفاقت سے پہلے تمھاری یاد میں گزارے ہیں۔ میری امیدوں، آرزوؤں امنگوں اور ولولوں نے ان سپنوں کے ساتھ جنم لیا تھا جو میں تمھارے متعلق دیکھا کرتا تھا۔ تمھاری رفاقت نے میری زندگی کو اعلیٰ و ارفع مقاصد عطا کیے۔ مجھے تمھارے بچوں کے لیے ایک ایسے وطن کی تلاش تھی جہاں وہ عزت اور آزادی کی زندگی بسر کر سکیں اور میسور میرے خوابوں کی جنت ہے۔ ایک بڑی آرزو کی تکمیل کے لیے عظیم قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرا اور میرے بیٹوں کا خون میسور کے ان ان گنت مجاہدوں کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں جو قوم کی عزت اور ناموس پر قربان ہو چکے ہیں۔ میں نے اننت پور میں مٹی کا وہ انبار دیکھا تھا جس میں صدیق اور مسعود کے ساتھ سینکڑوں اور شہیدوں کی لاشیں دفن تھیں۔ کتنے والدین، کتنی بہنیں اور بھائی، کتنے بچے اور بیویاں اننت پور سے کوسوں دور ان کا انتظار کر رہے ہوں گے اور آنے والے دور میں نہ معلوم اننت پور کی داستان میسور کے کتنے قلعوں، کتنے شہروں اور کتنی بستیوں میں دہرائی جائے گی۔

سلطان ٹیپو ان مجاہدوں کے قائد ہیں جنھیں قدرت نے ایک زوال پذیر قوم کے ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں تمھیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سلطان کی جدوجہد کا آخری انجام کیا ہوگا۔

— آگ اور خون کے کتنے طوفان ہیں جو ان کی منزل کے راستے میں حائل ہیں — بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ ملک کے اندر کتنے ابن الوقت، کتنے ضمیر فروش، منافق اور غدار ایسے ہیں جو قوم کے اس بطلِ جلیل کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھیں گے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا تو میسور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن جائے گا۔ وہ سلطان ٹیپو کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے اشاروں پر جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کریں گے لیکن اگر ذلت اور رسوائی ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے تو انھیں عزت اور سربلندی کا راستہ دکھانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

ہماری روحوں کو یہ اطمینان ہوگا کہ ہم خدا کی زمین پر اپنا آخری فرض ادا کر چکے ہیں اور جزا و سزا کے مالک کے دربار میں کھڑے ہو کر ہم کسی دن یہ کہہ سکیں گے کہ جب قوم گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی تو ہم نے اسے روشنی دکھلانے کی کوشش کی تھی۔ جب حق و باطل کا معرکہ گرم تھا تو ہم باطل کی بجائے حق کا ساتھ دینے والوں میں تھے اور جب قدرت نے ایک گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا دینے کے لیے ایک رجلِ عظیم کو بھیجا تھا تو ہم نے قوم کے دامن سے ذلت اور رسوائی کا داغ دھونے کے لیے اپنا خون پیش کیا تھا۔

رفیقۂ حیات! میں دعا کرتا ہوں کہ صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی ہمیشہ سلطان ٹیپو کے جانبازوں کی صفِ اول میں نظر آئیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں صرف جنگ اور اس کے نتائج کے متعلق سوچ سکتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ جب جنگ میں کسی فوج

کو شکست ہوتی ہے تو اس کے سپاہیوں کا خون رائگاں جاتا ہے لیکن اب یہ حقیقت میرا جزوِ ایمان بن چکی ہے کہ جو مجاہد فتح و شکست سے بے پروا ہو کر کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے جان دیتے ہیں۔ ان کی قربانیاں کبھی رائگاں نہیں جاتیں اور وہ مقاصد جن کے لیے یہ بے لوث قربانیاں دی جاتی ہیں۔ انسانیت کی قیمتی میراث بن کر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب حق و صداقت کے علمبرداروں کا ایک قافلہ گرتا ہے تو قدرت اس کے پرچم اٹھانے کے لیے کسی اور قافلے کو بھیج دیتی ہے۔ میں جب اپنی قوم کے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کا جھنڈا سلطان ٹیپو نے اٹھایا ہے، اسے گزشتہ صدیوں میں کئی اولوالعزم انسان بلند کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جن کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے زندہ اور باحمیت اقوام موجود تھیں اور ان کے مقدر میں کامیابیاں اور کامرانیاں تھیں۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنی اولوالعزمی اور غیر معمولی جرأت اور ہمت کے باوجود مغضوب اقوام کو راہِ راست پر نہ لا سکے اور جن مٹھی بھر سرفروشوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا ان کا مقدس خون قوم کی تاریخ کے روشن صفحات لکھنے کے کام نہ آ سکا۔ جب میں مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں تو بھی میرا ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہمارا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔ اس ملک کے کسی نہ کسی گوشے سے کوئی نہ کوئی اولوالعزم انسان اسے سہارا دیتا رہے گا اور پھر ایک دن ایسا آئے گا جب پوری قوم منظم اور متحد ہو کر اس جھنڈے تلے جمع ہو

جائے گی اور اس کا ہر قدم کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف ہوگا لیکن ان کامیابیوں اور کامرانیوں میں وہ لوگ برابر کے حصے دار سمجھے جائیں گے جنھوں نے ماضی کے بھیانک طوفانوں میں حق وانسانیت کا یہ پرچم بلند رکھا تھا۔ قیامت کے دن مختلف ادوار میں حق وانسانیت کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے اور میری آخری دعا یہ ہے، کہ یوسف، آصف، افضل، میرے اباجان اور صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی حق پرستوں کی اسی صف میں کھڑے ہوں ؛

تمھارا شوہر

جب فرحت خط پڑھنے میں منہمک تھی تو انور اور مراد کمرے میں داخل ہوئے اس کے سامنے کھڑے ہوگئے لیکن اسے اپنے گردو پیش کا احساس نہ تھا۔ کبھی خط کے الفاظ اور اس کی آنکھوں کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہوجاتے وہ آنسو پونچھتی اور دوبارہ خط پڑھنے میں مصروف ہوجاتی۔ خط ختم کرنے کے بعد وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے گردن اٹھائی اور اپنے بیٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمھارے اباجان مرے نہیں، وہ زندہ ہیں۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اس دنیا میں عزت اور آزادی کا تصور زندہ ہے۔ یہ خط تمھاری میراث ہے اور کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے اس سے بہتر میراث نہیں چھوڑ سکتا۔"

ایک ہفتہ بعد انور علی محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوچکا تھا اور اس کے بعد مراد علی ہر روز مکتب سے واپس آکر اپنی ماں کو سلطان کی فتوحات کی نئی نئی خبریں سنایا کرتا

تھا۔۔۔ "امی جان! بدنور فتح ہوچکا ہے۔ جنرل میتھیوز اور اس کی فوج کو پابہ زنجیر چتل ڈرگ کے قید خانے کی طرف لایا جارہا ہے ۔۔۔ امی جان! آج خبر آئی ہے کہ سلطان کی افواج منگلور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ آج یہ خبر آئی ہے کہ منگلور کا شہر فتح ہوچکا ہے اور قلعے کا محاصرہ جاری ہے" پھر ایک دن وہ بھاگتا ہوا آیا اور بلند آواز میں چلایا۔ "امی جان! منگلور کا قلعہ فتح ہوچکا ہے ؛"

Get more e-books from www.ketabton.com